tarjumaneafkar@yahoo.com

# سمرقند و بخارا کی خونیں سرگزشت

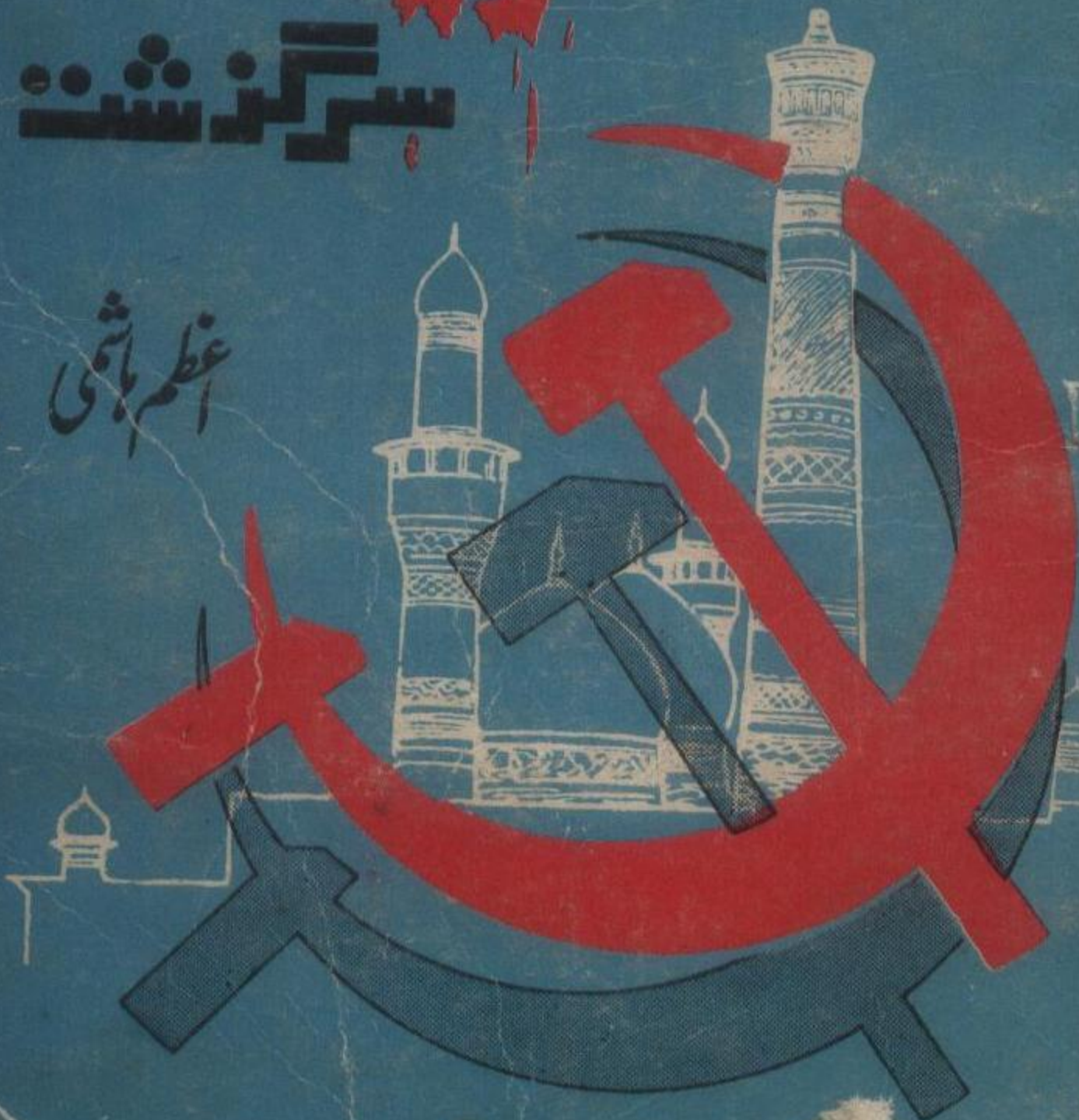

اعظم ہاشمی

مکتبۂ اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد۔ لاہور

tarjumaneafkar@yahoo.com

# سمرقند و بخارا کی خونیں سرگزشت

هدية من كفايت الله الهاشمي باكستان (حفيد المؤلف) عفي عنه

هذه قصة الهجرة من تركستان للشيخ أعظم الهاشمي بالأردية

tarjumaneafkar@yahoo.com

اعظم ہاشمی

ترجمان افکار لائبریری
بیاد اعظم ہاشمی ترک (رح)
کتاب #_____05_____

مکتبہ اُردو ڈائجسٹ، سمن آباد، لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ناشر: فاروق اعجاز

پبلشرز: مکتبہ اردو ڈائجسٹ

طابع: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

مطبع: اردو ڈائجسٹ پرنٹرز

اشاعت: سوم

[illegible] روپے

tarjumaneafkar@yahoo.com

# دیباچہ

سمرقند و بخارا کی یہ نظر سرگزشت، دو شہروں کی سرگزشت نہیں ہے۔ "سمرقند و بخارا" سے مُراد ترکستان کی وہ سرزمین ہے جو اسلامی تاریخ میں ماوراء النہر کے نام سے مشہور ہے۔ "سمرقند و بخارا" ملّتِ اسلامیہ کی عظیم الشان تاریخ کا زرّیں باب ہے۔ اِس خاک سے اُمّت کی بڑی بڑی نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے اُس کی دینی، علمی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کو رنگ و آب دینے میں گراں قدر حصّہ لیا۔ "سمرقند و بخارا کی خُونیں سرگزشت" اسی سرزمین سے تعلق رکھتی ہے۔ جب سوشلزم اِس علاقے پر مسلّط ہوا، تو اس پر کیا گزری؟ زیرِ نظر کتاب اسی داستان کا ایک مختصر باب ہے۔ مختصر باب اِس لیے کہ یہ صرف ان واقعات پر مشتمل ہے جو ترکستانی مہاجر اعظم ہاشمی نے خود دیکھے، سُنے یا جن سے وہ براہِ راست دوچار ہوئے۔

اعظم ہاشمی اُن ہزاروں تُرک مہاجرین میں سے ایک ہیں جو تُرکی، سعودی عرب اور مغربی یُورپ میں آباد ہیں۔ ہاشمی صاحب افغانستان کی راہ سے برّصغیر میں آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ جب پاکستان وجُود میں آیا، تو اِس اسلامی ریاست میں چلے آئے، وہ گزشتہ ۳۶، ۳۷ سال سے اِس داستان کو سینے میں چھپائے بیٹھے تھے۔ ان کے دوستوں نے بارہا کہا کہ وہ اپنی داستان قلمبند کر دیں، لیکن قلب و رُوح کے زخم کھول کر دکھانے کی وہ اپنے اندر ہمّت نہ پاتے۔ پاکستان میں سُرخ سامراج کے گماشتوں نے سوشلزم کا شور بلند کیا اور کچھ نام نہاد "مولانا" اور "مُفتی" اُن کے رکابدار بن کر میدان میں آئے، تو اعظم ہاشمی تڑپ اُٹھے۔ اُن کے زخم جیسے تازہ ہو گئے۔ سمرقند و بخارا میں بھی ٹھیک وہی کھیل کھیلا گیا تھا جو آج پاکستان میں کھیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہاں سوشلزم کے گماشتے اسی طرح معاشی مساوات اور غریبوں اور مزدوروں کی غمخواری کے نعرے لگا کر میدان میں آئے اور چند نام نہاد "مُلّاؤں" اور "مُفتیوں" نے اُن کے رکابداروں کا کردار ادا کیا۔ تُرکستان کے مسلمان اُن کے اِس کردار سے دھوکا کھا گئے۔ سوشلزم کو وہ محض ایک معاشی نظام کی حیثیت سے دیکھنے لگے، لیکن جب یہ

عفریت پوری طرح اُن پر مسلط ہو گیا، تو وہ اُن کے دین، تہذیب و روایات، ثقافت و تمدن اور آزادی سب کو نگل گیا۔ اعظم ہاشمی نے جب دیکھا کہ پاکستان کو بھی سمرقند و بخارا بنانے کی سازش ہو رہی ہے، تو انہوں نے پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے سوشلزم کے حقیقی خدوخال کھول کر رکھ دینے کا فیصلہ کر لیا؛ چنانچہ انہوں نے اپنی طویل و دردناک داستان قلمبند کی۔ راقم السطور نے اس کو از سرِ نو مرتب کر کے اپنے الفاظ میں لکھا۔ یہ خونیں سرگزشت اُردو ڈائجسٹ کے پانچ شماروں میں شائع ہوئی اور اب اسے کتابی صورت میں الگ شائع کیا جا رہا ہے۔

اِس داستان کے مخاطب یوں تو وہ نام نہاد "مولانا" اور "مفتی" بھی ہیں جو سوشلزم کے گماشتوں کے ہاتھوں میں دانستہ یا نادانستہ کھیل رہے ہیں۔ اگر اُن کے دل میں رائی برابر بھی ایمان موجود ہے، تو خدارا سوچیں کہ وہ کیسا خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں اور کن لوگوں کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں؛ تاہم اِس داستان کے اصل مخاطب پاکستان کے مسلمان عوام ہیں جنہوں نے اپنے دین، اپنی تہذیب، اپنی روایات کو ہندوؤں کے چنگل سے بچانے اور اسلام کے سایے میں زندگی بسر کرنے کے لیے جنگ لڑی اور آگ اور خون کے وسیع اور ہولناک سمندر سے گزر کر پاکستان کے ساحلِ مراد پر پہنچے۔ یہ خونیں سرگزشت انہی کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ وہ اِس سے عبرت حاصل کریں، پاکستان کو سمرقند و بخارا بنانے کی تگ و دو میں جو لوگ مصروف ہیں، اُن کے نعروں اور شرعی وضع قطع سے دھوکا نہ کھائیں اور کفر و الحاد کے اِن علمبرداروں کے خلاف اُسی جوش و جذبے کے ساتھ بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہو جائیں جس جذبے کے ساتھ وہ ہندوؤں کے عزائم کے خلاف کھڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت جو خطرہ مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں سے تھا آج وہی خطرہ پاکستان کی اسلامی مملکت کو سوشلزم کے گماشتوں اور اُن کے نام نہاد شرعی رکابداروں سے ہے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۶۹ء

آباد شاہ پوری

(۱)

وہ رات مجھے مرتے دم تک نہ بھولے گی۔ ۳۸ برس گزر چکے ہیں لیکن آج بھی اُس رات کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن کی تختی پر نقش ہے۔ شب و روز کی ہزاروں گردشوں کے باوجود اُس رات کی یادوں کی چمک دمک میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بعض اوقات تو یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے امّی جان احاطے کی دیوار کے پاس کھڑی مجھے رخصت کر رہی ہیں اور فرما رہی ہیں: "بیٹے، اللہ تمہارا حافظ و نگراں ہو، میری نصیحتوں کو مت بھولنا، ورنہ مَیں تم سے خوش نہ ہوں گی۔"

یہ ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے۔ آخر فروری یا شروع مارچ کی کوئی تاریخ تھی، مَیں اپنے گھر میں کھلاوت (تُرکی پلنگ) پر پڑا سو رہا تھا کہ امّی جان نے مجھے آہستہ سے جھنجھوڑ کر جگایا۔ مَیں آنکھیں مَلتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ فوراً ہی سارا معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ وہ گھڑی آپہنچی تھی جس کے لیے ہم ماں بیٹا کئی دنوں سے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ "بیٹا، اُٹھو وضو کرو۔" امّی جان نے کہا۔ یہ کہہ کر وہ مُڑیں اور کوزے میں پانی بھرنے لگیں۔ مَیں نے طہارت سے فارغ ہو کر وضو کیا، پھر خود امّی جان نے بھی وضو کیا۔ اب ہم دونوں ماں بیٹا بارگاہِ ایزدی میں جُھک گئے، دوگانہ ادا کیا، امّی جان نے اوراد و وظائف پڑھ کر مجھ پر پھُونکا، پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد دسترخوان اُٹھائے تشریف لائیں۔ ایک ہاتھ میں بٹیر کے سیخ کباب تھے۔ ایک کباب اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ کھانا کھا چکا، تو کہنے لگیں:

"میرے جگر گوشے، اُٹھو اور اپنے معصوم بھائی بہنوں کا آخری زندہ دیدار کر لو۔"

مَیں بڑھ کر اُن کی چارپائی کے قریب پہنچا۔ کم سن معصوم فرشتے دُنیا جہان سے بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ معصومیت کی نُور اُن کے چہروں پر دمک رہی تھی۔ مَیں نے باری باری ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اُن کے حق میں اللہ تعالیٰ سے خیر و عافیت

کی دُعا مانگی۔ وہ وقت میرے لیے بے حد صبر آزما تھا۔ محبت اور شفقت کے سوتے میرے دل کی گہرائیوں سے اُبلنے لگے۔ "اب مَیں اپنے بھائی بہنوں کو شاید کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔" مَیں نے سوچا۔ معاً میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے جنہیں مَیں نے پلکوں ہی پلکوں میں خشک کرنے کی کوشش کی۔ امّی جان تھیں تو ۶۵ برس کی، لیکن جوانوں سے زیادہ باہمت تھیں۔ کچھ دیر تک دَم سادھے میری طرف دیکھتی رہیں، پھر بولیں: "آؤ بیٹا" —— اُن کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا تکیہ نما بستر اُٹھایا اور چل پڑیں۔ مَیں ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کمرے سے نکل کر ہم صحن میں پہنچے، صحن سے باغیچے کا رُخ کیا، باغیچے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ اب ہم کھلے آسمان کے نیچے درختوں اور پودوں کے درمیان کھڑے تھے۔ امّی جان نے میری پیشانی چومی اور فرمایا:

"بیٹے، تم میرے بڑھاپے کا سہارا اور اُمیدوں کا مرکز ہو مگر جیسا کہ دیکھ رہے ہو، تم وطنِ عزیز میں رہ کر ایک مسلمان کی حیثیت میں میری خدمت نہیں کر سکتے، چنانچہ مَیں تمہیں دین و ایمان اور وطنِ عزیز کی خاطر کسی آزاد ملک میں چلے جانے کی اجازت دیتی ہوں، البتہ ایک شرط ہے، وہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو ترکستان کے مسلمانوں کی بے بسی اور دین کی بے حُرمتی کی خبر تمام مسلمانوں اور آزاد قوموں تک پہنچا دو۔ بیٹے، مَیں نے وضو کیے بغیر تمہیں کبھی دودھ نہیں پلایا۔ اگر تم نے اس مقصد کو فراموش کر دیا، تو مَیں کبھی راضی نہ ہوں گی۔ انسان کا مجد و شرف یہ ہے کہ وہ اپنے قول و قرار کا پابند رہے۔"

پھر امّی جان نے مجھے وہ چھوٹا سا تکیہ نما بستر دیا۔ کوئی دو سیر وزن ہوگا۔ کہنے لگیں:

"اس کی حفاظت کرنا۔ بالخصوص اس کے اندر جو قرآنِ کریم ہے، اُسے حرزِ جاں بنا کر رکھنا۔ منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ، تو اس کی موجودہ جلد اُتار کر نئی بنوالینا۔ پرانے گتّے کو اپنے ہاتھ سے توڑنا اور پھر اسے جلا ڈالنا اور راکھ کسی دریا یا کنوئیں میں ڈال دینا۔"

مزید تاکید کے طور پر فرمایا:

"دیکھو، تمہیں کوئی چیز اپنے پیدائشی وطن سے غافل نہ کرے، ہمدردوں کی ہمدردی فراموش نہ کرنا۔ جو تمہارے خدا کا دشمن اور ملک کا غاصب ہے وہ کبھی تمہارا دوست اور بہی خواہ نہیں ہو سکتا۔ بزدل انسان اپنی منزلِ مقصود سے محروم رہتا ہے۔ موت ایک بار آئے گی۔ ایمان سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ مرد اپنے قول سے نہیں پھرتے۔ جو شخص ان تین باتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے، اس کا وجود کوڑی کا نہیں رہتا۔"

امّی جان دیر تک پند و نصیحت کرتی رہیں۔ کوئی تین سوا تین کا عمل ہوگا۔ پچھلے پہر کے سنّاٹے میں کبھی کبھار کسی مُرغ کی بانگ سنائی دیتی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، درختوں کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ باغیچے سے گزر کر ہم احاطے کی دیوار کے نیچے پہنچے۔ امّی جان نے ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی، پھر میرے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور کندھے کو تھپکتے ہوئے کہا:

"جاؤ بیٹا، اللّٰہ تمہارا ساتھی اور مددگار ہے۔"

مَیں نے ایک آخری نظر اپنے باغ اور گھر پر ڈالی۔ اس باغ میں کتنے ہی پودے مَیں نے اپنے ہاتھ سے لگائے تھے اور انہیں خون اور پسینے سے سینچا تھا۔ اس گھر میں مَیں پیدا ہوا، پلا، بڑھا اور پروان چڑھا، وہ گھر جو ہماری صدیوں کی خاندانی روایات کا امین تھا، جس کے ایک ایک پتھر سے ماضی کی داستانیں اور میرے اپنے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ مَیں نے ٹھنڈی سانس بھری، امّی جان کو سلام عرض کیا، دیوار پر چڑھا اور باہر کُود گیا۔ ہمارے باغیچے اور بڑی سڑک کے درمیان قبرستان تھا۔ قبرستان میں ہُو کا عالم تھا۔ شکستہ قبریں اور اونچے نیچے مٹّی کے ڈھیر دیکھ کر ہول سا طاری ہوگیا، تاہم دل کڑا کر کے قبرستان میں داخل ہوا۔ ہاتھ میں امّی جان کا دیا ہوا عطیہ تھا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ باغیچے میں

سے ایک لمبی "ہُو" کی آواز آئی۔ فوراً پلٹا اور باغ میں آیا۔ امّی جان دیوار کے نیچے بیہوش پڑی تھیں، مُنہ پر پانی چھڑکا، تو آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے پاس دیکھ کر کہا:

"تم واپس کیوں آ گئے؟ اپنی منزل کھوٹی نہ کرو، ہمارا نگہبان وہ قادر و توانا ہے جس کے وجود پر یقین ہر ذی علم کا سرمایۂ زندگی ہے۔"

مَیں باغ میں سے نکلا اور نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔

(۲)

مَیں اپنے گھر سے رات کے وقت چوری چُھپے کیوں نکلا؟ کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کن مصائب سے دوچار ہوا؟ ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے مجھے ماضی کی طرف لوٹنا پڑے گا۔

فرغانہ (جو آجکل ازبکستان کہلاتا ہے) کے ضلع اندجان میں ایک چھوٹا سا قصبہ "قالعتی" ہے۔ مَیں اسی قصبے میں ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام خوجہ خان داملا ہے (داملا تُرکی میں مولانا کو کہتے ہیں)۔ دادا کا نام حضرت الشیخ عزت اللہ اور نانا کا غیاث الدین ایشان نمنگانی ہے۔ یہ سب حضرات اپنے وقت کے جیّد عالم تھے۔ نانا جان پُورے تُرکستان میں استاذ العالم کہلاتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ والد کے سلسلۂ نسب میں چار پُشت تک علمائے دین اور سلسلۂ نقشبندیہ کے خلفا ملتے ہیں۔ والدہ کی طرف سے میرا شجرۂ نسب سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ میرے ننھیال کے بزرگ قتیبہ بن مسلم کے ہمراہ تبلیغ دین کے لیے تُرکستان آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ اُس وقت سے اس گھرانے میں بڑے بڑے شیوخ اور علما پیدا ہوئے جن کے مزار میرے زمانۂ ہجرت تک موجود تھے۔

جب روسی زاروں نے تُرکستان پر جارحانہ حملہ کیا، تو میرے نانا غیاث الدین ایشان اور والدہ کے ماموں باطور تورہ نمنگانی اس جارحیت کی مزاحمت کرنے والوں کی صفِ اوّل میں شامل تھے، چنانچہ اس جُرم میں عُمر بھر نظر بند رہے اور نظر بندی کی حالت ہی میں انتقال ہوا۔ میرے تین ماموں عبدالمجید خان تورہ، عبدالرشید خان تورہ اور محی الدین خان تورہ بڑے متقی اور صاحبِ زہد و ورع بزرگ اور مرجعِ خاص و عام تھے۔ واضح رہے کہ "خان" کا لفظ تُرکستان میں یا تو سیّدوں کے لیے استعمال ہوتا ہے یا بادشاہوں کے لیے۔ ہمارا خاندان بہت بڑا تھا۔ ہم گیارہ بہن بھائی تھے۔ پانچ بھائی اور دو بہنیں مجھ سے بڑی تھیں۔ ہمارے خاندان کی خواتین تک عربی اور فارسی کی عالمہ تھیں۔ میری والدہ اور ان کی چار بہنیں بڑی جیّد عالمہ تھیں۔

ہمارا ذریعۂ معاش زراعت اور تجارت تھا۔ کُل سوا پانچ مربع زمین تھی۔ ڈھائی مربع زمین بارانی تھی اور باقی نہری۔ اس زمین میں باغات اور جنگلات بھی تھے اور کاشت بھی ہوتی تھی، چنانچہ ہم لوگ خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔

تُرکستان کے زرعی نظام کے بارے میں کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔ زمین کے مالک بالعموم خود کسان ہوتے تھے۔ روس کی طرح زمین پر کمیرے (SERF) کام نہیں کرتے تھے۔ مزارعت کا رواج بھی تھا، لیکن مزارعین کی بالکل حق تلفی نہ ہوتی تھی۔ انہیں اپنی محنت کا صلہ پُورا پُورا ملتا تھا۔ ایسے دہقان جن کی اپنی زمین نہیں تھی بہت کم تھے۔ ہندو پاکستان کی طرح بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار نہ تھے۔

میرے بچپن کا دَور انقلابی دَور تھا۔ ہمارے خاندان کے مرد تقریباً سب کے سب شہادت پا چکے تھے۔ امّی جان عربی اور فارسی کی عالمہ تھیں۔ انہی کی رہنمائی میں تعلیم کا آغاز کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے قصبے ہی میں حاصل کی۔ ثانوی تعلیم نمنگان، خوقند، سمرقند اور شہرِ سبز میں خفیہ طور پر جاری رکھی۔ خفیہ اس لیے کہ سوشلسٹوں نے تُرکستان پر قبضہ کرنے کے بعد دینی تعلیم ممنوع قرار دے دی تھی۔ دین کی تبلیغ و اشاعت تو بہت بڑا جُرم تھا۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے معنی یہ تھے کہ آپ خود بڑھ کر مصائب و آلام کو دعوت دے رہے ہیں۔

انقلابِ رُوس سے پہلے ہمارے یہاں عصری اور جدید تعلیم برائے نام تھی۔ ایک تو ذریعۂ تعلیم رُوسی زبان تھا، دوسرے تعلیمی اداروں کی سربراہی اور انتظام کیتھولک پادریوں کے ہاتھ میں تھا جو نہایت متعصب اور تنگ نظر تھے۔ استاد بھی بالعموم یہی لوگ ہوتے تھے۔ ان کا مشن تعلیم پھیلانے سے زیادہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ ان تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل لوگ بے دین بھی ہوتے اور روسی سامراج کے حامی بھی؛ چنانچہ عام مسلمانوں نے ان اداروں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ عوام کی نظر میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔

جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق تھا، تُرکستان میں ہزاروں مدارس تھے۔ تُرکی زبان ذریعۂ تعلیم تھی۔ کوئی شہر اور قصبہ درس گاہ سے خالی نہ تھا۔ مخیر حضرات نے لاتعداد مدارس کے لیے زمینیں وقف کر رکھی تھیں۔ طلبہ کو تعلیم مُفت ملتی تھی، لیکن وظائف یا کتابیں مستعار دینے کا رواج نہ تھا۔ طالب علم کو بارہ یا سولہ برس تک کے تعلیمی مصارف خود برداشت کرنا پڑتے تھے۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات یا تو کاروبار کرتے تھے یا رُوس کے مقبوضہ علاقوں اور ماتحت ریاستوں میں فتویٰ نویسی اور مسلمانوں کے شخصی قانون سے متعلق عدالتوں میں کسی منصب پر فائز ہو جاتے۔

ان درس گاہوں کی اپنی دنیا تھی۔ سیاست تو گویا شجرِ ممنوعہ تھی۔ یہ میدان علما نے لادین قوتوں کے لیے خالی چھوڑ رکھا تھا۔ تُرکستانی معاشرہ عالمِ اسلام سے بالکل بے خبر اور بڑی حد تک کٹا ہوا تھا۔ رہبانیت اور خوشحالی کی وجہ سے پورا معاشرہ خوابِ خرگوش میں مبتلا تھا۔ ہر شخص شاعر اور ہر فرد ہوس کار تھا۔ سال میں چھ مہینے سیر و تفریح میں کٹتے۔ شکار کھیلنا، نام و نمود کی خاطر مال و دولت لٹانا ہمارا طرۂ امتیاز اور امتیازی نشان بن چکا تھا۔ علما کی اکثریت تنگ نظر، جمود کا شکار اور فروعات میں اُلجھی ہوئی تھی۔ تصوّف کا دَور دورہ تھا۔ مشائخ اور صوفیا معاشرے اور قوم کے عملی مسائل سے بے نیاز خانقاہوں میں گُم تھے۔ مراقبہ، کشفِ قبور، عزلت گزینی، ریاضت، چلہ کشی، وحدت الوجود پر بحث مباحثے اور نفس کشی ان کا اپنا شغل بھی تھا اور اپنے مُریدوں کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے اس جمود پر کوئی تنقید کرتا، تو جواب ملتا: ہم پر کون سا دشمن حملہ آور ہے؟ اگر کبھی ایسا وقت آ بھی گیا، تو ہم جہاد کے لیے میدان میں نکل آئیں گے، بلکہ خانقاہی تربیت کا حقیقی مقصود جہاد کی تیاری ہی ہے۔

یہ تھے تُرکستان کے مسلمان معاشرے کے شب و روز جب ۱۹۱۷ء میں رُوس میں انقلاب آیا۔ زارشاہی کا تختہ اُلٹنے کے بعد جمہوریت پسند منشیشلسٹ رُوسیوں نے الیگزنڈر کرنسکی کی سربراہی میں عبوری حکومت قائم کر لی۔ ادھر تُرکستان نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ خوقند اس نو آزاد ریاست کا دارالحکومت تھا۔ کرنسکی حکومت نے تُرکستان کی اس آزاد مملکت کو تسلیم کر لیا، لیکن اُس کے پاس ایک دستہ فوج بھی نہ تھی۔ ملیشیا (نیشنل گارڈ) کے نام سے پولیس کے دستے تھے، تاہم آزاد حکومت کے رہنماؤں نے آزادی کو مستحکم کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ علما نے بھی ان کے ساتھ پُورا پُورا تعاون کیا۔ دستور ساز مجلس وجود میں آئی اور دستور سازی کا کام پوری تیزی سے شروع ہو گیا۔ اس اثنا میں کمونسٹوں نے لینن کی قیادت میں کرنسکی حکومت کا تختہ اُلٹ کر رُوس پر قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۹۱۸ء میں سوشلسٹ رُوس تُرکستان پر چڑھ دوڑا اور اس کی چند روزہ آزادی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں اس نے بخارا اور جمہوریۂ خیوا پر اپنے سامراجی چُنگل گاڑ دیے۔

کمونسٹوں نے تُرکستان پر مسلط ہوتے ہی زمینیں، باغات، دُکانیں اور کارگاہیں غصب کر لیں۔ کسان، تاجر، علما اور مذہب سے وابستہ افراد خواہ وہ پڑھے لکھے سفید پوش تھے یا اَن پڑھ مزدور اور کاشت کار، سب کو حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا گیا۔ نماز، روزہ جُرم قرار پائے۔ حج پر پابندی لگا دی اور مسجدیں

بند کر دیں۔

مسجدیں بند کرنے کے لیے مکارانہ ہتھکنڈے اختیار کیے گئے۔ سب سے پہلے مسجدوں اور مدرسوں کے اوقاف ضبط کر لیے گئے۔ اس طرح مسجدیں اور دینی درسگاہیں اپنے وسائلِ زندگی سے محروم ہو گئیں، پھر مسجدوں پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے گئے جب لوگوں نے چندہ جمع کر کے ٹیکس ادا کیا، تو چندہ دینے والوں پر دفینہ ٹیکس لگا دیا گیا۔ علانیہ کہا جانے لگا کہ جو لوگ مسجدوں کا ٹیکس ادا کرتے ہیں، انہوں نے خزانے چھپا رکھے ہیں، ہم یہ خزانے ان سے اگلوائیں گے۔ اب مسجد ٹیکس ادا کرنے کی جرأت کون کرتا؟ چنانچہ جب مقررہ میعاد میں ٹیکس ادا نہ ہوتا، تو ایک ہفتے بعد مسجد پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا جو وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا۔ ادھر جو لوگ نماز پڑھتے، ان پر "نمازی ٹیکس" عائد کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ لوگ گھروں میں نماز پڑھنے لگے اور مسجدیں ویران اور بے آباد ہو گئیں۔ جب کوئی مسجد اس طرح ویران ہو جاتی، تو ایک روز کمونسٹ اس میں جمع ہوتے اور ایک قرارداد منظور کرتے کہ یہ مسجد بے کار اور ویران پڑی ہے، اس میں کوئی شخص نماز پڑھنے نہیں آتا، اس لیے حکومت کو چاہیے وہ اس کو کسی رفاہی کام میں استعمال کرے۔ دوسرے روز قرارداد سرکاری گزٹ میں شائع ہو جاتی اور کمونسٹ مسجد پر قبضہ کر کے یا تو اسے شہید کر دیتے یا اصطبل، کلب اور رقص گھر وغیرہ میں بدل دیتے۔

کمونسٹ پارٹی کی شاخیں ایک ایک محلے میں کھول دی گئی تھیں۔ یہ شاخیں دین کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتیں اور اُسے بیخ و بُن سے اُکھاڑنے کے لیے منصوبے بناتیں۔ روزی کمانے کے لیے لائسنس حاصل کرنا لازمی قرار دے دیا گیا۔ لائسنس کے بغیر کسی شخص کو کھیتی باڑی، صنعت و حرفت، تجارت حتیٰ کہ محنت مزدوری کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ مذہب سے وابستگی اور ملی اور قومی روایات سے محبت رکھنے والوں کے لیے لائسنس کا حصول تقریباً ناممکن ہو گیا۔ اس کے لیے دین و ایمان سے برأت کا اعلان کرنا پڑتا۔ ادھر بدمعاشوں اور قاتلوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی۔ دیندار اور نماز روزے کے پابند مسلمانوں پر حملے ہونے لگے، لیکن کبھی کوئی قاتل گرفتار نہ ہوا۔ اس طرح ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔

۱۹۲۷ء کے بعد اس قتل و خونریزی اور اسلام دشمنی میں اور اضافہ ہو گیا۔ کمونسٹ اسلام پر بہتان طرازی کرتے، قرآن و حدیث، دین اور دینی پیشواؤں کے مضحکہ خیز کارٹون بنا کر مزاحیہ پرچوں اور مسجدوں میں چسپاں کرتے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کیچڑ اُچھالتے، تھیٹروں اور سینماؤں میں ہتک آمیز ڈرامے کھیلتے، ان کارٹونوں وغیرہ سے نظر بچانے کی کوشش کرنا جرم تھا۔ کمونسٹوں کی چیرہ دستیوں اور اسلام دشمنی کی انتہا یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضی پتلا بنا کر چوراہوں میں رکھ دیتے اور جو شخص بھی ادھر سے گزرتا، اس کو پکڑ لیتے اور بڑی دریدہ دہنی کے ساتھ اس پتلے کی طرف متوجہ کرتے۔ ان حالات میں ان لوگوں کے لیے جو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے تھے، اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ہجرت کر جائیں۔

ایک دن کا ذکر ہے، ہمارے قصبے کی بڑی مسجد میں کمونسٹوں نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ پورے قصبے میں ڈونڈی پٹوائی کہ ہر شخص کو حکم دیا جاتا ہے وہ اس جلسے میں شریک ہو، غیر حاضر رہنے والے کو سزا دی جائے گی۔ لوگ مارے باندھے جمع ہو گئے۔ مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے ناظمِ جلسہ نے اعلان کیا کہ روحانی لوگ مسجد سے چلے جائیں۔ واضح رہے کہ جو لوگ دین و مذہب سے عقیدت رکھتے ہیں، انہیں ترکستان میں رُوحانی کہا جاتا ہے۔ اس اعلان پر بہت سے لوگ اُٹھ کر چلے گئے۔ اب زیادہ تر آوارہ گرد، بدمعاش اور کمزور ایمان والے مرد یا ناسمجھ بچے باقی رہ گئے۔ کمونسٹوں نے جانے والوں کا نام لکھ لیا، تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر زور زور سے گھنٹے بجائے گئے۔ جی ہاں مسجد میں گھنٹے..... جس طرح

گرجوں میں بجائے جاتے ہیں۔ ایک تو ماحول پہلے ہی پُر ہول تھا گھنٹوں کی آواز سے ہیبت اور بڑھ گئی، پھر ایک شخص سٹیج پر آیا۔ بتایا گیا کہ یہ صاحب اسلامی فلسفی ہیں۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرتا اور مُنہ سے جھاگ اُڑاتا رہا۔ قلم میں طاقت نہیں کہ اس ہرزہ سرائی کو من وعن بیان کر سکے۔ مختصر الفاظ میں اُس نے کہا کہ مذہب بالخصوص اسلام نے خُدا کا تصور جو دلوں پر بٹھایا ہے اس کا مقصد عوام کو لُوٹنا ہے۔ یہ تصور سرمایہ داروں اور مُلاؤں نے اپنی شکم پروری کے لیے ایجاد کیا ہے۔ اللّٰہ، رسُولؐ، یوم آخرت، حشر ونشر، جنّت دوزخ، فرشتے اور جنّات وغیرہ تمام عقائد ڈھکوسلے ہیں اور رُوحانیوں کا بچھایا ہوا دام تزویر۔ کمیونسٹ پارٹی ان تصورات کا قلع قمع کر کے عوام اور محنت کشوں کو دام تزویر سے چھٹکارا دلانے کا عزم صمیم رکھتی ہے۔

مقرر پرجوش تقریر میں چلایا:

"کیا کوئی صاحب سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

اس دریدہ دہن کی خرافات سُن کر میرا خُون کھول رہا تھا۔ میں تڑپ کر اُٹھا اور کمیونسٹوں کے تیوروں کی پروا نہ کرتے ہوئے بولا: "جو لوگ تمہاری اس خرافات کا جواب دے سکتے تھے، اُنہیں تو تم نے نکال دیا، کیا اب اُن کی رُوح سے جواب مطلوب ہے؟" جوش کے عالم میں جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ بس اتنا احساس ہے کہ مسجد میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس سناٹے میں میری آواز گُونج رہی تھی۔ اچانک شور بلند ہوا: "پکڑو، پکڑو....." اور پھر کمیونسٹ چاروں طرف سے مجھ پر پل پڑے اور لاتیں اور مُکّے برسانے لگے۔ میرا کوٹ پھٹ گیا، کپڑے تار تار ہو گئے، پھر پولیس نے دھکّے دے کر اور ڈنڈے مار کر باہر نکال دیا۔ گھر پہنچا، تو امّی جان اور چھوٹے بہن بھائی میری حالت دیکھ کر پریشان ہوئے۔ امّی جان کی پریشانی تو دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کی پریشانی بجا تھی۔ دین اور اہلِ دین کا جو حشر ہو رہا تھا، وہ ان کے سامنے تھا۔ خود ہمارا اپنا خاندان بھی محفوظ نہ رہا تھا۔ سوشلسٹ پولیس میرے چچا، دو ماموں، ایک بہنوئی، دو خالہ زاد بھائیوں اور متعدد عزیزوں کو دینی پیشوا ہونے کے جرم میں ان کے گھروں سے پکڑ کر لے گئی تھی اور پھر آج تک پتہ نہ چل سکا تھا انہیں زمین کھا گئی ہے یا آسمان اُچک لے گیا ہے۔ امّی جان نے پُوچھا:

"بیٹے، ماں تم پر نثار، یہ تمہیں کس نے مارا ہے؟" مَیں نے ہر چند ٹالنے کی کوشش کی مگر امّی جان کا اصرار بڑھتا گیا۔ بار بار کے اصرار سے مجبور ہو کر مَیں نے ساری داستان سُنا دی۔ امّی جان سُن رہی تھیں اور رو رہی تھیں۔ سارا ماجرا سُن کر فرمایا: "نورِ بصر، یہ لوگ جاہل اور بے دین ہیں اور انہی کا راج ہے۔ ان بیہودہ لوگوں کو علم اور حقیقت کی ہوا تک نہیں لگی۔ ان کی خرافات دینِ حق پر محض بہتان ہیں۔ اچھا، مجھے اب تمہارے متعلق کچھ سوچنا پڑے گا۔ لو اب کھانا کھا لو۔"

دِل اس قدر بے چین اور مضطرب تھا کہ کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ امّی جان نے اپنے ہاتھ سے زبردستی چند نوالے کھلائے۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ امّی جان اور دو بہنوں نے میرے پیچھے نمازِ عشاء پڑھی، پھر امّی مجھے اپنے کمرۂ خاص میں لے گئیں، ایک کتاب دی اور فرمایا: "لو بیٹا، اس کا مطالعہ کرو۔"

مَیں نے کتاب کھول کر دیکھی، سیرت النبیؐ کی پہلی جلد تھی اور قازان میں چھپی تھی۔ امّی جان تو چلی گئیں۔ مَیں نے جو مطالعہ شروع کیا، تو ساری رات اسی میں کٹ گئی۔ صبح صادق سے کچھ پہلے امّی جان کمرے میں آئیں، میرے ہاتھ سے کتاب لے کر رکھ دی اور فرمایا:

"جانِ مادر، اب تھوڑی دیر آرام کر لو۔"

کوئی گھنٹہ بھر سویا ہوں گا کہ امّی دوبارہ تشریف لائیں اور نمازِ فجر کے لیے جگایا۔ صبح کی نماز بھی ہم نے باجماعت ادا کی۔ دن چڑھے باغبانی میں لگ گئے۔

دونوں چھوٹے بھائی مدرسے چلے گئے تھے۔ دوپہر کے بعد گھر آئے، تو امّی جان سے کچھ کہا۔ امّی بولیں: "یہ لوگ دشمنانِ دین

ہیں اور دشمن ایسے ہی بک بک کرتے ہیں۔"

پتہ چلا کہ مدرسے میں ڈرامہ ہوا تھا جس میں نماز، روزے اور دوسرے اسلامی شعائر پر حملے کیے گئے اور ان کا مذاق اڑایا گیا۔ دوسرے دن بچے سکول گئے، تو ان سے والدین کے تاثرات پوچھے گئے۔ پندرہ دن بعد امی جان کو اس بنیاد پر حقوقِ شہریت سے محروم کر دیا گیا کہ وہ روحانیہ اور عالمۂ دین ہیں۔ امی نے اس موقع پر فرمایا:

"اب ہمارا ایمان آزمایا جائے گا۔ ان لوگوں سے یہی توقع تھی۔ یہ بدمعاش اس سرزمین میں دینی شعور و احساس رکھنے والے کسی انسان کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

پھر امی جان مجھے الگ ایک طرف لے گئیں اور فرمایا: "بیٹے، کچھ خبر نہیں دشمن کب مجھے شہید یا جلاوطن کر دے۔ یہاں مسلمان بن کر رہنا ممکن نہیں رہا، میں تمہیں ہجرت کی اجازت دیتی ہوں۔ کسی اور ملک میں چلے جاؤ تاکہ ایک مسلمان کی زندگی بسر کر سکو۔"

اب ہمارا وقت زیادہ تر چپکے چپکے صلاح مشورے میں گزرتا۔ مجھے اپنے والد، دادا اور نانا سے نہایت گراں بہا اور نایاب ذخیرۂ کتب ملا تھا۔ امی جان کے مشورے سے والدِ مرحوم کے مہمان خانے کی تقریباً چھ فٹ موٹی دیوار میں شگاف کیا اور تمام کتابیں اس میں رکھ کر دیوار چن دی۔ ہمیں یقین تھا سوشلسٹ حکومت ضرور اس عمارت پر قبضہ کرے گی اور اس کو منہدم کرنے کے بجائے کسی سرکاری استعمال میں لے آئے گی۔

امی جان کو شہری حقوق سے محروم کرنے کے ٹھیک ۲۳ دن بعد میں ہجرت کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔

(۴)

مسلسل کئی گھنٹے چلنے کے بعد اگلے روز میں خضر آباد کے قریب پہنچا۔ خضر آباد ہمارے قصبے تالقی سے کوئی ۱۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ خاصا بڑا گاؤں ہے۔ ریلوے لائن پاس سے گزرتی ہے۔ گاؤں تک پہنچنے کے لیے دریائے سیحوں عبور کرنا پڑتا ہے۔ قریب پہنچا، تو دیکھا کہ روسی فوج نے گاؤں کو گھیر رکھا ہے۔ کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار فوجی ہوں گے۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ خضر آباد میں بھی کمیونسٹوں نے اسلام اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی اور دریدہ دہنی کی تھی، چنانچہ عوام نے مشتعل ہو کر ان کی تکا بوٹی کر دی، ریلوے لائن اکھاڑ ڈالی اور بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ روسی فوج انہیں کچلنے آئی تھی۔ فوج کا پہرا بڑا سخت تھا۔ روسی جگہ جگہ رائفلیں تانے کھڑے تھے اور کوئی شخص ان سے بچ کر نہ جا سکتا تھا۔ میں ایک انتہائی پریشان کن مشکل میں پڑ گیا۔ یہاں سے واپس جا سکتا تھا نہ بھاگ سکتا تھا، نہ چھپنے ہی کی کوئی جگہ تھی۔ اس روز میں نے پہلی بار موت کو اپنے سر پر کھڑے دیکھا۔ فوجیوں کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹکا اور پھر زبان پر ایمان مجمل اور مفصل بے اختیار جاری ہو گئے اور ایک عجیب عالم خود فراموشی طاری ہو گیا۔ قدم اٹھائے اور چل پڑا۔ ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے، تو دیکھا فوجی بہت دور پیچھے رہ گئے ہیں۔ فی الواقع یہ ایک حیران کن تجربہ تھا۔ میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس راستے پر قدم قدم پر روسی فوج کے سپاہی پہرا دے رہے تھے وہاں ان کی نگاہوں سے بچ کر کیسے نکل آیا۔

اسی شام "اوچی" پہنچا۔ یہاں والدِ مرحوم کے ایک ہم سبق عالم رہتے تھے۔ علم و عمل کے لحاظ سے بڑی زبردست شخصیت کے مالک تھے۔ سوشلزم کے چنگل اس شہر پر بھی دراز ہو چکے تھے اور ان کا پہلا شکار والدِ مرحوم کے یہی دوست ہوئے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ اس مردِ حق پرست کو گزشتہ رات کمیونسٹوں نے شہید کر دیا۔ اہلِ محلہ نے مجھے نمنگان جانے والے راستے پر ڈال دیا۔ اگلے روز میں نمنگان پہنچ گیا۔ یہ میرا ننھیالی شہر ہے۔ یہاں میری والدہ کی جائداد اور حویلی تھی جو انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ نمنگان کے حالات نسبتاً بہتر تھے۔ چند روز یہاں رہا اور پھر ریل گاڑی کے ذریعے خوقند پہنچا۔

خوقند، ترکستان کا تاریخی شہر ہے۔ خاصا وسیع اور بڑا۔ زارشاہی کے خاتمے پر ترکستان میں جو چند روزہ آزاد حکومت قائم ہوئی، اُس کا صدر مقام یہی تھا۔ قالقتی سے ۵۲ امیل کے فاصلے پر ہے۔ خوقند میں کمونسٹوں کے مظالم پورے عروج پر تھے۔ ان سے تنگ آکر مسلمانوں نے ایک خفیہ تحریک شروع کر دی تھی۔ جب بھی کمونسٹ، اسلام، اللہ تعالیٰ اور رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دریدہ دہنی کرتے یا علما کو اذیت دیتے، تحریک کے رضاکار رات کے وقت انہیں قتل کر ڈالتے اور ان کا سر ایک بند گاڑی میں رکھ کر پولیس چوکی پر پہنچا دیتے۔ ساتھ ہی ایک رقعہ چھوڑ جاتے جس میں کچھ اس قسم کی عبارت ہوتی تھی:

"تم لوگ دین کے خلاف بہتان طرازی اور ہرزہ سرائی کرتے ہو اور ہمارے علما کو اپنی خرافات کا جواب دینے کا موقع نہیں دیتے۔ ہمارے بچّوں کو اسلام سے بدظن کرتے ہو۔ اب ہم تم سے اسی طرح نبٹیں گے۔"

مسلمانوں کی اس جوابی تحریک سے کمونسٹوں میں خوف وہراس کی زبردست لہر دوڑ گئی تھی۔ کوئی کمونسٹ اپنی جان محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ اِدھر رات ہوتی، اُدھر وہ اپنے گھروں میں دبک جاتے۔ آخر کار مسجدوں اور بازاروں میں اعلان کروایا گیا کہ کسی شخص کو زبردستی کمونسٹ نہیں بنایا جائے گا۔ وہ کمونسٹ پارٹی میں شامل ہوتا ہے یا نہیں، یہ اس کی اپنی صوابدید اور مرضی پر منحصر ہے۔ نیز روحانیوں کو بھی راشن کارڈ جاری کیے جائیں گے۔ اگرچہ کمونسٹوں نے محض ایک چال چلی تھی، تاہم میری طرح اور بہت سے سادہ دل لوگ بھی اس اعلان سے مطمئن ہو گئے۔ مَیں نے فیصلہ کیا کہ یہیں رہ کر علم دین حاصل کروں گا۔

شیخ محمد جان عرف بائی دُوِ داملا خوقند کے مشہور عالم تھے۔ میرے نانا کے شاگرد اور والدِ مرحوم کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ کمونسٹوں نے انہیں اپنے گھر میں نظر بند کر رکھا تھا۔ اس اعلان کے بعد اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنا تعارف کرایا اور عرض کی:

"مَیں یہیں رہ کر دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

شیخ کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر فرمایا:

"بیٹا، دینی تعلیم کی تحصیل ممنوع قرار دی جا چکی ہے۔ صرف ایک صورت ہے، تم دن بھر نہ سہی، آدھا دن ہی شہر میں محنت مزدوری کرو۔ اس طرح تمہیں میرے ہاں رہنے کا بہانہ مل جائے گا۔"

مَیں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ دن بھر محنت مشقت کرتا اور رات کو شیخ سے علم دین حاصل کرتا۔ شیخ محمد جان داملا کمونزم کے نظریۂ الحاد پر گہری نظر رکھتے تھے۔ تعلیم دیتے وقت سب سے زیادہ زور اسی پر دیتے۔ کمونسٹ جو دعوے کرتے اور اسلام پر جو بہتان گھڑتے، اُن کا پردہ بڑے قوی دلائل سے چاک کرتے۔

مجھے خوقند میں وارد ہوئے تیسرا مہینہ جا رہا تھا کہ کمونسٹوں نے اپنی اسلام دشمن سرگرمیاں پھر سے شروع کر دیں۔ کمونسٹ حکومت نے پوری آبادی کی محلّہ وار فہرست مرتّب کی اور اسلام پسند شہریوں کی کڑی نگرانی کرنے لگی۔ "عوامی پولیس" میں شہر کے غنڈے اور بدمعاش بھرتی کیے اور ان کے ذریعے اہلِ دین کو ڈرانے دھمکانے اور زدوکوب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پھر گرفتاریوں اور اعترافِ جرم کا وسیع شیطانی چکر چل پڑا۔ ستر اسّی آدمی روزانہ غائب ہونے لگے۔ مَیں خوقند کے متعدد بچے کھچے علما کی خدمت میں حاضر ہوا، ان سے اس نازک و سنگین صورتِ حال کا ذکر کیا اور رہنمائی چاہی، مگر وہ لوگ بالکل مایوس اور بے بس ہو چکے تھے۔ اکثر کا جواب یہی تھا:

"بیٹا، ہم لوگ تو موت اور شہادت کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔"

اب کمونسٹ بالکل بے لگام ہو چکے تھے، وہ احتیاط جو خفیہ تحریک کی وجہ سے انہوں نے چند روز کے لیے اختیار کی تھی، بالائے طاق رکھ دی گئی تھی۔ عوام بڑی حد تک لیڈرشپ سے محروم کر دیے گئے تھے، اس لیے اب احتیاط کی

ضرورت باقی بھی نہیں رہی تھی۔ عام مسلمانوں میں جوش و خروش کے بجائے دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور قوتِ مزاحمت جواب دے گئی تھی۔ کسی شخص کی جان اور عزت محفوظ نہ تھی۔

میرے پاس ایک حمائل شریف (قرآنِ کریم) تھی جس کے کچھ اوراق پھٹ گئے تھے۔ میں ایک جلد ساز کی دُکان پر گیا۔ یہ دُکان ٹوپی بازار میں تھی جو خوقند کی جامع مسجد کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ جلد ساز حمائل شریف کے اوراق درست کر رہا تھا کہ ایک کمونسٹ آیا اور بولا:

"کیا میری کتابوں کی جلد تیار ہو گئی ہے؟"

"ایک گھنٹے کا کام باقی ہے، تیار کر کے پہنچا دوں گا"۔۔۔ جلد ساز نے جواب دیا۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" اس نے جلد ساز سے پھر سوال کیا۔

"یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔" جلد ساز گھبرا گیا۔ "یہ قرآن شریف ہے۔ بس چند منٹ کا کام باقی ہے، پھر آپ کا کام پورا کر دوں گا"۔ اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

کمونسٹ غضب ناک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جھپٹا مار کر قرآن شریف جلد ساز کے ہاتھ سے چھین لیا اور چلایا:

"اس خرافات (معاذ اللہ معاذ اللہ) کے لیے تم نے میرا کام روک رکھا ہے؟"

اور پھر قرآن شریف کو باہر سڑک پر دے مارا۔ اُف میرے خدا، میرا خون کھول اُٹھا، پھر جیسے بے بسی نے میرے ہاتھ پاؤں جکڑ لیے۔ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ چپ چاپ اُٹھا، قرآن شریف جا کر اٹھایا۔ اسے بار بار چوما۔ اس خیال سے دل بھر آیا کہ ہم مسلمانوں کی دُوں ہمتی اور ضعفِ ایمانی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دشمن کھلے عام کتابِ الٰہی کی توہین کرتے ہیں اور ہم اس کی آن پر جان بھی نہیں دے سکتے۔ اتنے میں وہ بدمعاش دُکان سے نکل کر چل کھڑا ہوا۔ میں نے جلد ساز کی اُجرت ادا کی اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کچھ فاصلے پر تھانہ تھا، جونہی وہ تھانے کے قریب پہنچا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچ کر تھانے میں لے گیا۔ تھانیدار کو سارا ماجرا سنایا اور اس بدبخت کی جسارت پر احتجاج کیا۔ میں نے کہا:

"اس شخص نے حکومت کے احکام کی صریح خلاف ورزی کی ہے، خود حکومت اعلان کر چکی ہے کہ کوئی کمونسٹ دین کے خلاف نہ کوئی نازیبا حرکت کرے گا اور نہ کسی کو جبراً مُلحد بنائے گا، اس شخص کو اس مذموم حرکت کی سزا دی جائے"۔

تھانیدار نے میری شکایت پر کان تک نہ دھرا، بلکہ اُلٹا مجھی کو ڈانٹا اور کہنے لگا:

"ہمارے پاس کیا لینے آئے ہو؟ اپنے خدا کے پاس جاؤ جس کے نام پر تم مر جانے کا عقیدہ رکھتے ہو"۔

❖ ❖ ❖

تھانے سے نکل کر جامع مسجد پہنچا۔ یہ مسجد آج بھی موجود ہے، اسے عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں یہ شہر کے عین وسط میں تھی اور اپنے حجروں سمیت تقریباً ۱۸ ایکڑ رقبے میں پھیلی ہوئی تھی، نہایت خوبصورت مسجد تھی اور بے شمار ستونوں پر تعمیر کی گئی تھی۔ مسجد کے شمال میں بڑی سڑک تھی جس پر مسجد کی وقف دُکانیں تھیں۔ مشرق میں بہت بڑا حمام تھا۔ اس مسجد میں خوقند کے امیر خود نماز پڑھایا کرتے تھے یا پھر شیخ الاسلام ان کی نیابت کا فرض انجام دیتے۔ اس آخری دور میں شیخ الاسلام تورہ خان دا ملا تھے۔ ہفتے میں ایک دن وعظ فرماتے۔ کمونسٹوں نے ابھی تک ان پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا؛ البتہ موقع کے منتظر تھے اور ان کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔ ایک شخص کو باقاعدہ ان پر متعین کر رکھا تھا، جو ان کی نقل و حرکت اور ان کے پاس آنے جانے والوں پر نظر رکھتا

تھا۔ یہ شخص ایک افغانی تھا۔ بڑا ہی باتونی اور خوش گفتار۔ دیکھنے میں بے حد خدا رسیدہ نظر آتا، لمبی ڈاڑھی، پیشانی پر بڑا سا گٹا، نماز باجماعت کبھی ناغہ نہ ہوتی۔ صبح کی نماز میں سب سے پہلے آتا، ستونوں کی آڑ میں کھڑا ہو جاتا اور دیر تک طویل قرأت کے ساتھ سُنتیں پڑھتا رہتا۔ اس دوران میں ہر آنے والے پر اس کی نظر رہتی۔ مسجد میں افغانی لباس پہن کر آتا اور باہر مقامی لباس میں چلتا پھرتا۔

مجھے اس شخص کی حرکتیں اور احوال مشکوک سے محسوس ہوئے؛ چنانچہ میں اس کے تجسس میں لگ گیا۔ پتہ چلا کہ اس جناب کو کمونسٹ پارٹی کی طرف سے تورہ خاں داملا پر مسلط کیا گیا ہے۔ جناب والا نہ صرف تورہ خاں داملا کے خلاف جاسوسی کرتے ہیں، بلکہ ان کے ملاقاتیوں اور ہجرت کر کے افغانستان جانے والوں کا سراغ بھی لگاتے ہیں۔

میں "آسپرہ گزری" میں منتقل ہو گیا۔ یہ خوقند کا ایک محلہ ہے۔ اس محلے کی مسجد بڑی خوبصورت اور حجرے بڑے شاندار ہیں۔ مجھے ایک حجرہ رہنے کو مل گیا؛ تاہم میں نماز بالعموم جامع مسجد ہی میں پڑھتا۔ ایک روز نماز جمعہ کے بعد کچھ لوگ تورہ خان داملا کے مدرسے میں آئے۔ افغانی نما شتہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں بھی ان لوگوں کے پیچھے پیچھے تورہ خاں کی خدمت میں پہنچ گیا۔ تورہ خاں کو جب پتہ چلا کہ میں ان کے استاد حضرت غیاث الدین ایشاں کا نواسا اور ہم سبق خوبہ خان کا بیٹا ہوں، تو بڑی شفقت سے پیش آئے۔ میری پیشانی چومی اور دیر تک گھر والوں کا حال احوال پوچھتے رہے؛ پھر نمنگان کے بعض مشہور علما کا نام لے کر دریافت کیا:

"وہ آجکل کس حال میں ہیں؟"

جب میں نے بتایا کہ ان سب کو کمونسٹوں نے یا تو شہید کر دیا ہے یا جلاوطن، تو محفل پر غم ناک خاموشی طاری ہو گئی۔

میں نے شیخ سے اجازت چاہی، تو پوچھا:

"آپ کہاں مقیم ہیں؟"

"مدرسہ میر عالم میں ایک حجرہ لیا ہے۔" میں نے عرض کیا۔ صحیح پتہ اس افغانی کی وجہ سے نہیں بتایا۔ مدرسہ میر عالم اسلامی دورِ حکومت کا ایک عظیم الشان دارالعلوم تھا جس میں ہزاروں طلبا پڑھا کرتے تھے۔ اساتذہ اور طلبا کے لیے مدرسے کے ساتھ ہی ایک وسیع اقامت گاہ تھی۔ آجکل یہ مدرسہ اور اس کی اقامت گاہ سوشلسٹ مزدوروں اور مختلف شہروں سے آنے والے روسی مسافروں کی رہائش گاہ بنی ہوئی ہے۔

تورہ خان داملا مجھے اکثر اپنے ساتھ گھر لے جاتے اور بڑی شفقت فرماتے۔ ایک روز وہی افغانی نما شتہ مجھے باصرار اپنے حجرے میں لے گیا۔ ترکستان میں حجرے بالعموم دو حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے پہلے حصے میں بٹھایا اور خود دوسرے حصے میں لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ اتفاق سے میز پر رکھے ہوئے کاغذات اُٹھانے یاد نہ رہے۔ میری نظر ایک کاغذ پر پڑی۔ اس پر تورہ خان داملا کا نام لکھا ہوا تھا۔ کاغذ اُٹھا کر دیکھا، تو علما کی ایک پوری فہرست تھی۔ میں نے کاغذ فوراً اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اتنے میں افغانی گھبرایا ہوا آیا۔ جلدی جلدی اپنے کاغذات سمیٹے اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ بظاہر بڑے تپاک سے باتیں کرتا رہا اور میری خاطر تواضع بھی کی۔

افغانی کے متعلق میرے شبہات درست نکلے۔ میں نے کاغذ تورہ خان داملا کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے ایک نظر اس پر ڈالی، مجھے دعائیں دیں اور کاغذ اپنے پاس رکھ لیا۔ دو تین دن کے بعد افغانی غائب ہو گیا۔ غالباً مجاہدین نے اسے اُچک کر ٹھکانے لگا دیا۔

❊ ❊ ❊

میں نے تورہ خاں داملا سے گزارش کی کہ میں شرح عقائدِ نسفی کا درس لینا چاہتا ہوں۔ فرمایا:

"ہمیں فقہ اکبر اور قصیدۂ اعمالی ایسی کتابیں پڑھنی چاہییں۔ عوام کو اسلام کے بنیادی عقائد سے آگاہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اسی طرح ہم کمونزم کے مبادی اور مادہ پرستی کے اصولوں کی تردید بھی کر سکتے ہیں۔ آج کے دور میں یونانی فلسفہ کسی کام نہیں آسکتا۔ اس پر ہمیں اپنے وقت اور صلاحیتیں ضائع نہیں کرنی چاہییں۔"

میں نے عرض کیا: "جیسے آپ پسند فرمائیں، فقیر کو منظور ہے۔"

فرمایا: "عشاء کے بعد غریب خانے پر آجایا کرو۔"

ارشاد کے مطابق حاضرِ خدمت رہنے لگا۔ ۲۱ دن کی تربیت کے بعد مجھے ٹوپی بازار کی مسجد میں امامت پر مامور کر دیا۔ ٹوپی بازار کے محلّے میں یہودی بھی رہتے تھے اور ارمنی بھی۔ علاوہ بریں کمونسٹوں کا ایک ادارہ بھی تھا۔ نمازِ صبح کے بعد میں قرآن کریم کا درس بھی دیتا اور اسلام کے بنیادی عقائد بھی بیان کرتا۔ درس اور تقریریں خاصی مفید اور مؤثر ثابت ہوئیں۔ کمونسٹوں کو یہ بات بُری طرح کھٹکی۔ آخر اُن کے اشارے پر محلّے میں یہ سوال کھڑا کر دیا گیا کہ امام صاحب بالغ بھی ہیں یا نہیں، کیونکہ ان کے ڈاڑھی مُونچھ تو ہے نہیں۔ میں نے تورہ خان کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا قصّہ کہہ سنایا۔ فرمایا:

"محلّے ہی کے کسی آدمی کو نماز کے لیے آگے کر دیا کریں، البتہ درس جاری رکھیے۔"

استاد کے مشورے پر عمل کیا۔ چند روز اطمینان سے گزر گئے۔ محلّے کے بچے بھی آنے لگے۔ اس طرح ایک چھوٹا سا مکتب بھی کھل گیا۔ اب میرے پاسپورٹ اور پرمٹ کا مسئلہ کھڑا کر دیا گیا۔ (واضح رہے کہ سوشلسٹوں نے حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد مُلک کے اندر ایک جگہ سے دُوسری جگہ جانے کے لیے بھی پرمٹ سسٹم رائج کر دیا تھا) تاہم انہی کمونسٹوں میں سے ایک شخص نے معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ کمونسٹ اسلامی تعلیمات کو بے مایہ ثابت کرنے کے لیے علماء سے حجّت بازی کرتے، دین کا مذاق اور تمسخر اڑاتے، وجودِ باری تعالیٰ پر الٹی سیدھی بحثیں کرتے۔ مدرسہ بیگ کے صدر مفتی الدین مخدوم کی تقریر بڑی مؤثر ہوتی۔ لوگوں پر بالعموم رقت طاری ہو جاتی۔

کمونسٹوں کی دین دُشمن سرگرمیوں نے علماء کو جیسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ اُنہوں نے نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے تبلیغ و اشاعتِ دین کا سلسلہ از سرِ نو شروع کر دیا۔ تبلیغی پروگرام مرتب کیے جانے لگے۔ کمونسٹوں کے لیے ایسی سرگرمیاں ناقابلِ برداشت تھیں؛ چنانچہ پکڑ دھکڑ اور دار و گیر کا سلسلہ اور تیز ہو گیا۔ باقیماندہ جری اور حق گو علماء راتوں رات غائب ہونے لگے۔ آدھی رات کے وقت دروازے پر دستک ہوتی، دروازہ کھلتا، خفیہ پولیس کے آدمی دروازے پر کھڑے ہوتے۔ مطلوبہ شخص کو بند گاڑی میں ٹھنسا تے اور لے جاتے۔ گھر والوں سے کہہ دیتے کہ دو چار روز میں واپس آجائیں گے۔ ہفتے دو ہفتے بعد خبر ملتی کہ انہیں جلاوطن کر دیا گیا ہے اور جلاوطنی کے معنی یہ تھے کہ سائبیریا کے برفیلے جہنم میں بھیج دیا گیا ہے۔

* * *

ٹوپی مسجد میں میرے درس و تدریس کا سلسلہ بدستور جاری تھا؛ چنانچہ پارٹی کے اجلاس میں مجھے اغوا کرنے کی قرارداد منظور کی۔ رات کے تین بجے ایک نوجوان نے آ کر مجھے خبر دی۔ یہ شخص کمسومل (نوجوانوں کی کمونسٹ لیگ) کا رکن تھا۔ بظاہر کٹر کمونسٹ تھا، لیکن در پردہ ملک کی صورتِ حال سے سخت اندوہگیں تھا اور میرا گہرا دوست بن گیا تھا۔ اسی کی کوشش سے میرے پاسپورٹ اور پرمٹ کا معاملہ رفت گزشت ہوا تھا؛ چنانچہ میری نگرانی شروع کر دی گئی تاکہ میں بھاگنے نہ پاؤں۔ انہی دوست کا ایک نابینا چچا میرا ایوب تھا۔

یہ حضرت صبح سویرے میرے حجرے میں آنازل ہوئے اور فقہی مسائل چھیڑ دیے۔ گیارہ بجے کے قریب میرا نوجوان دوست آگیا۔ آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا، تو اُس نے دیکھا کہ چچا صاحب تشریف فرما ہیں۔ مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ باہر گیا تو کہا: وہ لوگ آج ہی کسی وقت آپ کو پکڑنے کا پختہ فیصلہ کر چکے ہیں۔ یہ حضرت جو بیٹھے ہیں، تو اُن کا مقصد یہ ہے کہ آپ کہیں جانے نہ پائیں۔ ذرا بھی دیر مت کریں، فوراً یہاں سے نکل جائیں۔

نوجوان تو رخصت ہو گیا۔ میں واپس حجرے میں پہنچا۔ ایوب نے پوچھا:

"یہ کون شخص تھا؟"

"محلے کے ایک شریر کمونسٹ کا لڑکا۔" میں نے جواب دیا۔ پھر امّی جان کا عطا کردہ بستر اُٹھایا اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ یہاں سے مدرسۂ خشتین میں پہنچا۔ اس مدرسے کے طالب علم عبدالمالک قاری تھے۔ قاری صاحب پایتوق کے رہنے والے تھے جو اندجان سے چار فرسخ کے فاصلے پر ہے۔ میرے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے میرا تعارف ایک حافظ صاحب سے کرایا۔ یہ صاحب مجاہدین کے آدمی تھے جنہوں نے تاجکستان کے پہاڑوں میں کمونسٹوں کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ بچّوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ ناظرہ بھی اور حفظ سے بھی، مگر اصل کام نوجوانوں کو کمونسٹوں کے خلاف فکری اسلحے سے لیس کرنا تھا۔ اِن کا انداز بیان بڑا شگفتہ اور دلنشیں تھا۔

میں یہاں تقریباً ایک ہفتہ رہا۔ اِس عرصے میں خوقند ایک زبردست ہلچل سے ہمکنار رہا۔ سیکڑوں علما جلاوطن اور ہزاروں مسلمان شہید کر دیے گئے۔ اِس کا ردِّ عمل بھی بڑا سخت ہوا۔ دس ہزار سے زائد روسی اور کمونسٹ جہنم رسید ہو گئے۔ اِن دنوں خوقند میں موت بڑی ارزاں تھی۔ مسلمانوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ یا تو کمونسٹوں کو ختم کر دیں گے یا خود مر جائیں گے۔ اب کمونسٹوں کا گھیرا تنگ تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے سمرقند جانے کا فیصلہ کر لیا۔ روانہ ہوتے وقت قاری صاحب نے تقریباً بیس سیر چاول دیے کہ سمرقند میں بیچ دینا تمہارا سفر خرچ نکل آئے گا۔ سمرقند میں اپنے ایک دوست کا پتہ بھی دیا۔

(۶)

سمرقند کا ٹکٹ بڑے ڈرامائی انداز میں حاصل کیا اور شام کے آٹھ بجے ڈاک گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ اگلے روز خواص پہنچا۔ یہ ایک جنکشن ہے۔ یہاں ایک ریسٹوران کے مالک نے چاول چالیس روبل میں خرید لیے۔ خواص مصنوعی قحط کے چُنگل میں گرفتار تھا۔ کمونسٹوں نے کسانوں سے کھانے پینے کی تمام چیزیں چھین لی تھیں۔ شام کی گاڑی سے پھر سمرقند روانہ ہوا۔ ریسٹوران کے مالک نے مشورہ دیا کہ میں سمرقندی لباس پہن لوں تو بہتر رہے گا؛ چنانچہ میں نے سمرقند کا لمبا اور اُونچی آستین والا کوٹ خرید لیا۔ اب میں ہو بہو سمرقندی زیک دکھائی دیتا تھا۔

سمرقند پہنچ کر مدرسہ تیلا کار میں ٹھہرا۔ اگلے روز قاری الماسی کے دوست کو تلاش کیا۔ اُنہوں نے مجھے شہر سے کوئی ۲½ فرسخ کے فاصلے پر "میمن قشلاق" پہنچا دیا۔ یہاں ایک عالم دین داماد بخاری کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے ذہین، نکتہ دان اور دُور اندیش، مرجع خاص و عام تھے۔ عبدالمالک قاری نے ان کے نام ایک رُقعہ لکھ دیا تھا۔ میں نے پیش کرنا چاہا، تو لینے سے انکار کر دیا۔ فرمایا:

"میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ نہ کسی سے کوئی خط پڑھوں گا اور نہ کوئی سرگوشی کروں گا۔"

تاہم وہ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور پیش کی۔ میں نے عرض کیا: قاری عثمان الماس

نے سلام کہا ہے۔ دیر تک سلام کا جواب دیتے رہے۔ علیہ السلام وعلیہ السلام ..... پھر فرمایا: الماس درست ہست؟

"درست ہست۔" میں نے جواب دیا۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے؟" انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

"بخارا یا شہر سبز۔"

"شہر سبز کس کے ہاں جائیں گے؟"

"وہاں میرے ماموں رہتے ہیں۔"

ماموں کا نام بتایا، تو پتہ چلا کہ داملا بخاری میرے منجھلے ماموں محی الدین خان تورہ کے شاگرد ہیں۔ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ باتوں ہی باتوں میں فرمایا:

"مسلمانوں کی آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ کون کھرا ہے اور کون کھوٹا۔ اب انہیں الگ الگ چھانٹا جائے گا۔"

داملا بخاری ہفتے میں ایک دن قرآن وحدیث کا درس دیا کرتے جس میں شریک ہونے کے لیے لوگ خطرہ مول لے کر دور دور سے آتے۔ سمین قشلاق سے کچھ فاصلے پر تختہ قراچہ پہاڑیوں کا مشہور سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انہی پہاڑیوں میں مجاہدین کا مرکز تھا۔ مجاہدین روزانہ پہاڑوں سے اترتے، کمونسٹوں پر اچانک ٹوٹ پڑتے۔ تھوڑی دیر تک معرکۂ کارزار گرم رہتا اور پھر مار دھاڑ کر کے غائب ہو جاتے۔ داملا بخاری کمونسٹوں کی بدزبانی کا جواب بھی دیتے تھے اور مجاہدین کی تربیت بھی کرتے۔

ایک دن مجھ سے فرمایا: ہم ترکستانی مسلمان کفرانِ نعمت میں مبتلا تھے۔ خصوصاً علما حضرات۔ سیلاب امڈتا رہا اور وہ پڑے سوتے رہے۔ جاگے بھی تو اس وقت جب سیلاب مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی دیواروں سے آٹکرایا۔ اب غفلت شعاری کے اس گناہِ عظیم کا کفارہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ علما اپنی جانوں پر کھیل جائیں۔

(۷)

بخاری صاحب کی خدمت میں ہفتہ بھر رہا اور پھر بخارا کی طرف روانہ ہو گیا۔ بخارا سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر ریلوے کا بڑا جنکشن کاگان ہے۔ یہاں سے بخارا تک چھوٹی پٹڑی کی ریل گاڑی جاتی ہے۔ میں گاڑی میں سوار ہونے کے بجائے پیدل ہی چل پڑا۔ رات گئے ایک گاؤں میں پہنچا۔ مسجد میں نماز پڑھ کر سونے لگا، تو امام نے روک دیا۔ اس پر بحث چھڑ گئی۔ امام کہتا تھا: مسجد میں سونا مکروہ ہے۔ میں کہتا تھا کہ مسافر کے لیے مسجد میں ٹھہرنا اور سونا مکروہ نہیں ہے۔ آخر بحث میں زچ ہو کر امام نے کہا:

"فرقے کی طرف سے سخت احکام ہیں۔"

"فرقہ..... کون سا فرقہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"بالائی (جانگی)۔" امام نے للکارتے ہوئے کہا۔ "تو نہیں جانتا فرقہ کون ہے؟ کمونسٹ پارٹی۔"

"کمونسٹ خدا کے منکر ہیں۔ ان کا مسجد کے انتظام سے کیا تعلق؟" میں نے کہا۔

"تم کون ہو نادان بچے؟ اوزبک، تاجک، قرغیز، قازق یا ترکمان؟"

"اوزبک۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں تو یہاں آنے کی بھی اجازت نہیں ہے، اپنی خیر مناؤ اور چلے جاؤ۔" وہ زور سے چیخا۔

بادلِ نخواستہ مسجد سے نکلا اور رات گاؤں سے باہر ایک درخت کے نیچے گزاری۔ صبح نماز پڑھنے مسجد میں آیا، تو دروازہ مقفل تھا، چنانچہ بخارا کی طرف چل کھڑا ہوا۔ آٹھ بجے کے قریب شہر میں پہنچا۔ "محلہ غجدوانی" میں ایک خوبصورت مسجد دکھائی دی۔ اندر داخل ہوا، تو کچھ عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں اور مسجد میں کئی خاندانوں نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ بعد ازاں پتہ چلا کہ یہ یہودی کمونسٹوں

کے خاندان ہیں اور انہیں سوشلسٹ حکومت نے آباد کیا ہے۔

باہر نکلا تو دُور بینڈ باجے کی آواز سُنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ قریب تر آتی جا رہی تھی، شاید کوئی جلوس تھا۔ چند منٹ کے بعد پُورا منظر میرے سامنے تھا۔ آگے آگے فوجی دستہ بینڈ کی دُھن پر مارچ کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے ہزاروں کمونسٹ قطار در قطار اپنے پرچم اُٹھائے چلے آ رہے تھے۔ ہر قطار ایک عورت اور ایک مرد پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ شہر کے وسط میں ایک بہت بڑے حوض کے پاس جمع ہو گئے جو حوض دیوانِ بیگی کہلاتا ہے۔ دراصل اس روز کمونسٹ "یومِ بے پردگی" منا رہے تھے۔ چند سال پہلے اسی دن انہوں نے سُرخ فوج کی مدد سے مسلمان عورتوں کے چہروں سے بُرقعے اُتار کر انہیں آگ لگا دی تھی۔ جن خواتین نے بُرقع اُتارنے سے انکار کیا تھا اُن کے گھر والوں کو سخت اذیتیں دی گئیں، حتیٰ کہ اُنہیں بچانے کے لیے عورتوں نے نقاب اُتار ڈالے۔ اب وہ ہر سال بے پردگی کی تقریب مناتے تھے۔ جلوس کے اختتام پر کمونسٹوں نے جلسہ منعقد کیا جس میں دینی شعائر کے خلاف دل کھول کر ہرزہ سرائی کی اور اتفاقِ رائے سے قرار داد منظور کی کہ تمام بڑی مساجد میں لینن کے مجسمے نصب کیے جائیں۔

بخارا میں مَیں تین دن رہا، مگر یہ تین دن میرے لیے تین سال سے بھی بھاری تھے۔ حالات انتہائی اضطراب انگیز تھے۔ پُورا ترکستان مظالم کی چکی میں پس رہا تھا، مگر بخارا کے مسلمان جن مظالم سے دوچار تھے، دوسرے علاقوں کے مظالم کی ان کے آگے کوئی حیثیت نہ تھی۔ اسلام اور خُدا و رسُولؐ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ اور معاندانہ سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ کمونسٹوں کی زبان اور کمونسٹ پارٹی کی مرضی قانون تھی۔ انسانی اور شہری حقوق ان کے قدموں تلے پامال ہو رہے تھے۔ دینی عقائد اور شعائر کے ساتھ وابستگی کا اظہار عذاب مول لینے کے مترادف تھا۔

بخارا میں آٹھ سو دینی مدارس تھے، لیکن اب وہ قال اللہ اور قال الرسولؐ کی آوازوں سے محروم ہو چکے تھے۔ کوئی اصطبل بنا ہوا تھا، کوئی گودام کا کام دے رہا تھا۔ کوئی کلب بن چکا تھا اور کسی سے رقص و سرود کی آوازیں اُٹھ رہی تھیں۔ اکثر مسجدیں بند پڑی تھیں۔ بعض میں یہودی اور دوسری غیر قوموں کے خاندان مقیم تھے۔ ہر شخص دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ رہنمایانِ ملت اور دینی پیشوا یا تو شہید کر دیے گئے تھے یا جلاوطن۔ جیل خانے دیندار مسلمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ عوام سخت پست حوصلہ اور جذبۂ دینی سے خالی ہو چکے تھے۔ فرغانہ اور سمرقند میں کم از کم مزاحمت تو ہو رہی تھی، یہاں جیسے تیمور کے گھر سے غیرت و حمیت کا جنازہ ہی نکل گیا تھا۔ دل کو سخت صدمہ ہوا۔ بار بار سوچا کیا اب مجھے اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ بخارا میں آئے مجھے دو سرا دن تھا کہ طبیعت کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ آخر مشہور مسجد مغاک میں جا چھپا۔ یہ مسجد زیرِ زمین ہے۔ خیال آیا کہ استخارہ تو کروں، شاید ہادیٔ مطلق سے کوئی رہنمائی مل جائے۔ وضو کیا۔ دو رکعت نماز پڑھی، استخارے کی دُعا مانگی اور پڑ کر سو گیا۔

صبح صادق کے وقت پہلے مؤذن آیا، پھر دو آدمی اور آئے اور ہم چار آدمیوں نے نمازِ فجر ادا کی۔ ان لوگوں کی زبانی پتہ چلا کہ رات شہر پر قیامت گزر گئی۔ ہوا یُوں کہ دن کے وقت کمونسٹوں نے پھر جلوس نکالا اور اسلام اور خُدا و رسُولؐ کے خلاف ہرزہ سرائی کی، دینی شعائر کا تمسخر اُڑایا۔ اس پر چند نوجوان مسلمان مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے دو تین سربرآوردہ کمونسٹوں کو قتل کر ڈالا۔ اس پر کمونسٹ پارٹی کے درندے اور سُرخ فوج کے وحشی سپاہی شہر بھر میں پھیل گئے اور قتلِ عام شروع کر دیا۔ لوگوں کو گھروں میں گھس گھس کر نکالا گیا اور گولی ماری گئی۔ صبح کے وقت بخارا کے گلی کوچے لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔

# ۲

دوپہر تک میں مسجدِ مغاک ہی میں رہا۔ گیارہ بجے کے قریب باہر نکلا اور حوض ویران یکّی پہنچا۔ میرے ہاتھ میں توروا (موٹی دری سے بنا ہوا تھیلا) تھا جس میں موچیوں کے اوزار تھے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا، پھر سفیدے کے ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک نوجوان آیا۔ تقریباً میری ہی عمر کا ہوگا۔ آتے ہی بلا تکلف پوچھا:

"یہاں کب آئے؟"

اس بے تکلفی پر میں گھبرا گیا، تاہم فوراً سنبھلا۔ جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر دیا:

"تم یہاں کب سے ہو؟"

"دو مہینے سے۔" اس نے جواب دیا۔

"کس جگہ کے ہو؟" میں نے پھر پوچھا۔

"اندجان کے محلے گلکتیپہ کا۔" نوجوان نے کہا اور پھر دریافت کیا: "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"فائقی کا۔"

"یہاں کیسے آنا ہوا؟"

"روزگار کی تلاش میں۔"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"یماقچی (موچی) ہوں۔"

"خوب، ہر طرح کا یماق کر لیتے ہو؟"

"دراصل میں یچی گر ہوں۔" (یچی، نرم چمڑے سے بنے ہوئے موزے کو کہتے ہیں۔)

"آؤ، میرے ساتھ چلو، وہیں گھر پر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ مجھے اپنا موزہ بھی ٹھیک کروانا ہے۔"

میں نوجوان کے ساتھ ہو لیا۔ اس کی چال ڈھال سے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے پہلے سے جانتا ہے۔ بطورِ احتیاط وہ مجھ سے کئی قدم آگے چل رہا تھا۔ بخارا کے گلی کوچے بڑے تنگ ہیں، دونوں طرف بلند و بالا عمارتیں ہیں، ہم پیچ و خم کھاتی

ہوئی گلیوں میں چلے جا رہے تھے۔ ایک مرتبہ مُڑ کر دیکھا، تو نوجوان غائب تھا۔ میں ایک تراہے پر کھڑا تھا۔ بڑا پریشان ہوا۔ منزل کا اتہ پتہ بھی نہ تھا کہ لوگوں سے پوچھ لیتا۔ آخر واپس حوض دیوان بیگی جانے کا فیصلہ کیا۔ اتنے میں ایک صاحب متقطع صورت آپہنچے، مجھے حیران و پریشان دیکھ کر پوچھا:

"اے بالائی، چرا فرفشانی و حیرانی داری؟" (اے پہاڑی، تم پریشان سے نظر آتے ہو، کیا بات ہے؟)

"مجھے نماز پیشیں (ظہر) پڑھنی ہے، سوچ رہا ہوں کس مسجد میں پڑھوں۔" میں نے جواب دیا۔

"نادان بالائی، نام نماز نہ گیر، ہمراہ من بشو، حالات خراب شدہ است، تمام مساجد بند شدہ است۔" (نادان پہاڑی، نماز کا نام نہ لو، میرے ساتھ آجاؤ، شہر کے حالات خراب ہو گئے ہیں، تمام مسجدیں بند کر دی گئی ہیں۔)

میں اس شخص کی خوبصورت دستار، لمبے چغے اور مقطع ڈاڑھی سے دھوکا کھا گیا۔ خیال کیا شاید کسی مدرسے کا مدرس یا مسجد کا خطیب ہے۔ ہمدرد و غم خوار سمجھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ آگے جو کچھ بیتی، چونکہ سوشلزم کی اس داستان سے کوئی تعلق نہیں ہے جو میں بیان کر رہا ہوں، اس لیے ساری تفصیلات نظر انداز کرتا ہوں۔ قصہ مختصر یہ شخص مجھے اپنی قلعہ نما حویلی میں لے گیا۔ اس نے کوئی منت مانی تھی اور مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتا تھا۔ وہ تو زندگی باقی تھی کہ اللہ نے اس کی بیوی اور نوجوان بیٹی کے دل میں رحم ڈال دیا اور میں اس کے خنجر سے بچ نکلا۔

اس ناگہانی مصیبت سے نجات پا کر حویلی سے باہر آیا، تو شام ہو رہی تھی۔ پوچھتا پاچھتا حوض دیوان بیگی پہنچا اور درختوں کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ سورج ڈوب رہا تھا، سڑکیں سنسان ہو چلی تھیں۔ اب ایک نیا مسئلہ درپیش تھا، وہ یہ کہ رات کہاں بسر کروں۔ اسی سوچ میں تھا کہ اُمید کی کرن چمکی۔ وہی نوجوان دوست جن سے میں دوپہر کے وقت بچھڑ گیا تھا حوض کے کنارے کھڑے دکھائی دیے۔ وہ خاصے پریشان تھے اور ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔ معاً ان کی نظر مجھ پر پڑی، لپک کر آئے میرا "تورو" اٹھایا اور چل دیے۔ میں بھی چپ چاپ ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستے میں کہنے لگے:

"میں تو بالکل مایوس ہو گیا تھا، اب تک کوئی دس چکر کاٹ چکا ہوں۔ کیا بات ہوئی تھی؟"

"راستہ بھول کر شہر کے دوسرے کنارے جا نکلا، وہاں سے ابھی ابھی واپس آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اب کہاں جانے والے تھے؟"

"مسجد مغاک۔" میں نے کہا۔

ان کے چہرے پر غم واندوہ کی گہری گھٹا چھا گئی۔ کہنے لگے:

"افسوس، مسجد مغاک کے خطیب بھی اپنے گھر میں شہید کر دیے گئے، بڑے جری اور حق گو عالم تھے۔ کل کمونسٹوں نے جلسے میں جب خدا اور رسولؐ اور قرآن و قیامت کے خلاف یاوہ گوئی کی اور اعلان کیا کہ ہم نے خدا کو بخارا سے باہر نکال دیا ہے، اب روسانی عوام کو لوٹ کھسوٹ نہ سکیں گے، خدا اور رسولؐ وغیرہ سب ان روحانیوں کے ہتھکنڈے ہیں جو انہوں نے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے ایجاد کر رکھے ہیں، ایسا ہی ہتھکنڈا بہاؤالدین کی وہ وصیت ہے جس میں اُس نے کہا ہے کہ جب تک میری قبر کی ایک اینٹ بھی موجود ہے، کفار اس سرزمین میں قدم نہیں رکھ سکتے، اس ہتھکنڈے کی قلعی بھی ہم نے کھول کر رکھ دی اور اس کے مزار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خطیب صاحب ان کی ہرزہ سرائی سے بے تاب ہو کر اُٹھے، ولولہ انگیز تقریر کی، کمونسٹوں کے اس اتہام کی تکذیب کی اور دلائل سے ثابت کر دیا کہ یہ کتابیں اور وصیت نامہ محض جعلی اور لغو ہیں اور خود کمونسٹوں نے گھڑی ہیں۔ اسلام ایسی خرافات سے بالکل پاک ہے۔ اسی اثنا میں سُرخ فوج کا دستہ پہنچ گیا، لوگ منتشر ہو گئے، سُرخ فوجیوں نے مقامی کمونسٹوں کی رہنمائی میں گھروں میں گھس گھس کر ہزاروں

دیندار افراد اور علما کو گولی مار دی۔ انہی کشتگانِ ستم میں مسجدِ منغاک کے پیش خطیب بھی تھے۔"

ہم جلد ہی اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ یہ نوجوان، افغان مستشار (مشیر) کا ترجمان تھا اور انہی کی کوٹھی میں رہتا تھا۔ میرے لیے تو فرشتۂ غیب ثابت ہوا۔ تعارفی پرچہ بنوا کر دیا جو آگے چل کر بڑے کام آیا۔ اسی سے میں نے کاگان (نیا بخارا) سے قرشی اور قرشی سے شہرِ سبز جانے کے لیے ریلوے پرمٹ کا کام لیا۔ میرے رفیق نے بتایا افغان مستشار بڑے دیندار آدمی ہیں۔ کابل میں ایک ہندی مولوی رہتے ہیں جن کا شمار تحریک آزادیٔ ہند کے رہنماؤں میں ہوتا ہے، مستشار صاحب ان کے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ (بعد میں پتہ چلا کہ یہ "ہندی مولوی" مولانا منصور انصاری تھے) لیکن ان کے ملنے جلنے والے اکثر لوگ کمونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادھر بخارا، قرشی، غذار اور شہرِ سبز کے جدید علما سے بھی ان کے گہرے روابط ہیں۔ ان سے گاہے گاہے ملنے بھی جاتے ہیں۔ . . . .

اتنے میں مستشار صاحب خود تشریف لے آئے۔ پوچھا:

"یہی آپ کا بھتیجا ہے جس کو صبح سے تلاش کر رہے تھے؟"

"بلے (جی ہاں) جناب" میرے دوست نے کہا۔

"کہاں کا قصد ہے؟"

"کل ہی آیا ہے، اب سوچے گا کیا کرنا ہے۔"

"فارسی جانتا ہے؟"

"جی ہاں، عربی فارسی پڑھا ہوا ہے۔"

مستشار صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ عربی اور فارسی کے چند اشعار پڑھے اور ان کا مطلب پوچھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس امتحان میں کامیاب رہا۔ اب مستشار صاحب میرے قریب بیٹھ گئے، کہنے لگے:

"ملاؤں اور مشائخ نے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ کل مسلمانوں کے عقیدے کی قلعی کھل گئی۔"

"کونسا عقیدہ؟" میں نے عرض کی۔

"کمونسٹ پارٹی نے شیخ بہاؤالدین کے وصیت نامے کا انکشاف کیا ہے۔"

"نہیں جناب، ایک جدید عالم نے کمونسٹوں کے اس بہتان کا [illegible] کیا تھا، چنانچہ ان کو گولی مار دی گئی۔"

"اچھا، یہ بات ہے" مستشار نے فوراً موضوع کا رخ بدل دیا اور پوچھا:

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"قرشی اور غذار کے راستے شہرِ سبز جانا چاہتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

مستشار صاحب اپنے ترجمان سے مخاطب ہوئے اور کہا:

"میری طرف سے حضرت صاحب شیخ جلال الدین ایشاں کے نام خط لکھ دو کہ اس طالبِ علم کو آپ کی تربیت میں بھیج رہا ہوں۔ کل شہر کے کیسا ریٹ سے بھی کچھ کروا دوں گا۔"

پھر میری طرف دیکھا اور کہا:

"اپنے آپ کو بخارا کے کسی گاؤں کا رہنے والا ظاہر کریں، فرغانوی بالکل نہ کہیں۔"

میں نے سبب پوچھا، تو کہا "کل کے ہنگامے میں سرخ فوج کا مقابلہ کرنے والے فرغانہ اور سمرقند کے ازبک نوجوان ہی تھے۔"

"بہت اچھا جناب" میں نے کہا۔ "ان علاقوں کے لوگ کمونسٹوں کی بدمعاشی اور دغابازی سے خوب واقف ہیں۔"

مستشار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ترکستان کی روایت کے مطابق ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما، اور عرض کی:

"جناب، لینن اور مارکس کی پارٹی ہماری ہی نہیں ہر مسلمان کی دشمن ہے۔ آپ ہمارے ماضی اور حال سے عبرت پکڑیں۔ — انشاء اللہ ہم ان کو ٹکنے نہ دیں گے۔"

انہوں نے خدا حافظ کہا اور بالائی منزل پر چلے گئے۔

میرے دوست نے میرے لیے ایک رقعہ لکھا اور اس پر مستشار صاحب کے دستخط کرانے چلا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد آیا، تو رقعے کے ساتھ ایک اور مکتوب بھی تھا جس میں گزشتہ دن کے خونیں واقعات درج تھے۔ مستشار صاحب نے ایک عینی شاہد کی حیثیت سے ان کی توثیق کی تھی۔

میرے دوست بہت خوش تھے، کہنے لگے:

"صاحب کھل گئے، وہ کمونسٹوں سے متنفر ہو چکے ہیں، درحقیقت بڑے کھرے مسلمان ہیں۔ اب ہمارے کام کا راستہ متعین ہو گیا ہے۔ یہ پیر صاحب جن کے نام انہوں نے خط دیا ہے، افغانستان کے کم از کم ایک تہائی باشندے ان کے مرید ہیں، غازی امان اللہ خاں کے حامی ہیں اور غازی کی کمونسٹوں سے گاڑھی چھنتی ہے۔"

میرے دوست مجھے دور تک چھوڑنے آئے۔ مسجد مغاک میں پہنچا، تو موذن صاحب موجود تھے۔ پہلے روز انہیں صبح کے وقت نماز میں دیکھا تھا اور بات چیت کا موقع نہ ملا تھا، بڑھ کر مصافحہ کیا اور پانچ روبل کا ایک "سبز کرسین" (نئے سکے کا نام) ان کے ہاتھ میں دے دیا اور عرض کی: میری طرف سے ہدیہ قبول فرمائیے۔ موذن بہت خوش ہوا، پوچھا:

"تم کون ہو اور کیا کام کرتے ہو؟"

"شہر سبز کا باشندہ ہوں، موچی کا کام کرتا ہوں، دیرینہ آرزو تھی کہ بخارا کی زیارت کروں۔ کل آیا اور شامتِ اعمال سے کمونسٹوں کے ہنگامے اور فساد سے دوچار ہو گیا۔"

"او ہو، تم بھی ازبک ہو اور کمونسٹوں سے ٹکرائے تھے۔" موذن نے بڑے عجیب انداز سے کہا۔

"نہیں بھائی، میں جب پہنچا، تو شہر فساد کی گرفت میں تھا، مجھے اس سے کیا واسطہ؟" میں نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔

"سنو بھائی، میں بھی شہر سبز کا رہنے والا ہوں، کل کمونسٹوں یہودیوں اور آرمینیوں نے سرخ فوج کے ساتھ مل کر بڑی تباہی مچائی۔ روحانیوں اور علما کو چن چن کر قتل کیا۔ کوئی چار گھنٹے گزرے تھے ازبکوں کا ایک گروہ نہ جانے کہاں سے آیا اور اچانک شہر پر ٹوٹ پڑا، سرخ فوج کے سپاہیوں اور چھ سات سو کمونسٹوں کا صفایا کر کے غائب ہو گیا۔۔۔۔۔"

موذن نے ساری داستان سنا دی۔ اس کی باتوں سے میرے جذبات بھڑک اٹھے۔ سوچا ان مجاہدین سے رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ رقت بھری آواز میں پوچھا:

"داملا صاحب، ان ازبکوں کے بارے میں مفصل معلومات مل سکتی ہیں؟"

"کیوں؟" اس نے کہا: "کیا تمہیں ان لوگوں سے دلچسپی ہے؟"

"جناب، آپ نے کمونسٹوں کی خونریزی اور مسلمانوں کی بیچارگی کی جو داستان سنائی ہے، اسے سن کر کس مسلمان کا خون نہیں کھولے گا؟" میرا سوال تو فطری اور ایمان کے تقاضے پر مبنی تھا۔

"تم ازبک ہو؟" موذن نے پوچھا۔

"داملا صاحب، کیا آپ بھی ان مجاہدین میں شامل تھے؟" میں نے الٹا سوال کر دیا۔ موذن سہم کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا:

"عشاء کا وقت قریب ہے، تم یہیں بیٹھو۔ میں ذرا گھر تک ہو آؤں۔"

"بھائی صاحب، میں تو رات بھی یہیں گزاروں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ جیسے تمہاری مرضی۔" موذن بولا اور بغیر سلام کیے لمبے لمبے ڈگ بھر کر چلا گیا۔ جیسے اسے بڑی ہی جلدی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ شخص ضرور کمونسٹوں کا ساتھی ہے اور پولیس کو اطلاع دینے گیا ہے۔ اس کی باتیں اور طور اطوار سب مشکوک تھے۔ میں نے فوراً اپنا سامان اٹھایا۔ مسجد سے نکلا اور حوض دیوان بیگی چلا گیا۔ رات جوں توں کر کے بسر کی۔ صبح اٹھا اور

کاگان کا راستہ لیا۔ چلتے چلتے ایک عظیم الشان کوٹھی کے پاس سے گزرا، تو وہی کل والے دوست مل گئے۔ پتہ چلا کہ اس کوٹھی میں ان کا دفتر ہے۔ کہنے لگے:

"مَیں رات تمہارے لیے کچھ کھانا لے کر مسجدِ منعاک گیا تھا، مگر وہاں تو ایک بھیڑ سی لگی تھی، آٹھ دس پچیکیہ (سُرخ سپاہی) بھی کھڑے تھے —— دُور ہی سے پلٹ آیا۔

"میرا اندازہ ٹھیک نکلا، یہ اس مؤذن ہی کی کارستانی تھی۔" مَیں نے جی ہی جی میں کہا۔ کچھ دیر باتیں کیں، نوجوان دوست نے پانچ پانچ روبل کے کچھ نوٹ دیے اور پھر میں کاگان کی طرف روانہ ہو گیا۔

## (۲)

بخارا سے کاگان آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان چھوٹی لائن کی ریل گاڑی چلتی ہے، یہ ریل گاڑی پچھلے کئی روز سے بند تھی، اس لیے سارا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا پڑا۔ کاگان مین لائن پر بہت بڑا ریلوے جنکشن ہے۔ یہاں سے تاشقند، فرغانہ، ترمذ، عشق آباد اور ماسکو ہر طرف گاڑیاں جاتی ہیں۔ اسٹیشن پر پہنچا، تو پتہ چلا قرشی کی طرف ہفتے میں ایک دن لوکل ٹرین جاتی ہے، باقی تمام گاڑیاں فوجی ساز و سامان اور فوج کے لیے وقف کی جا چکی ہیں۔

کاگان اسٹیشن کے قریب پارسیوں کا ایک ریستوران تھا، میں اندر جا کر بیٹھ گیا اور سبز چائے کا آرڈر دیا۔ ایک بڑے میاں چائے لے کر آئے، میز پر چائے دانی رکھتی، میری طرف دیکھا اور بڑبڑائے:

"اے یزدان، ہمراز تو، بہ ہمہ نگران۔" (اے خدا سب کچھ تیری طرف سے ہے، تو ہی سب کی حفاظت کر۔)

مَیں نے گھور کر بڑے میاں کو دیکھا، وہ چائے رکھ کر چلے گئے، کچھ دُور جا کر پلٹے اور آہستہ سے پُوچھا:

"اے بالائی، فارسی می دانی؟" (اے پہاڑی، تو فارسی جانتا ہے۔)

"کم کم" مَیں نے کہا۔

"تو از فرغانہ، شناختم نہ؟" (تم فرغانہ کے رہنے والے ہو نا، کیا نہیں پہچانا؟)

"شہر سبز بھی فرغانہ کی طرح کھلی ہوا، سطح مرتفع اور پھلوں کا مرکز ہے، شاید اسی لیے آپ مجھے فرغانہ کا خیال کر رہے ہیں۔" مَیں نے جواب دیا۔

بڑے میاں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولکہ (رُوسی ڈبل روٹی) لے کر آئے، میری زبان سے بے اختیار نکل گیا:

"مَیں ان کی ڈبل روٹی نہیں کھایا کرتا۔" پھر اپنے تھیلے سے سمرقندی کلچے کا ایک ٹکڑا نکالا۔ میمین قشلاق سے روانہ ہوتے وقت داملا بخاری صاحب نے کلچوں کے چند ٹکڑے مجھے عنایت فرمائے تھے، یہ ٹکڑا انھی میں سے ایک تھا۔ بڑے میاں نے کلچے کو غور سے دیکھا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور پھر آہستہ سے بولے:

"یہ ٹکڑا "قلیچ بازوں" کا پس خوردہ معلوم ہوتا ہے، ٹھیک ہے نا؟" بڑے میاں کا مطلب یہ تھا کہ یہ ٹکڑا مجاہدین اور چھاپہ ماروں کے دستر خوان کا بچا ہوا ہے۔

مَیں نے تجاہل سے کام لیا: "اتنی فارسی مجھے نہیں آتی، بس کام چلانے کی حد تک جانتا ہوں۔"

بڑے میاں مُسکرائے اور کہنے لگے:

"صاحبزادے، کلچے کا یہ ٹکڑا داملا بخاری کے دستر خوان کا ہے، کیا وہیں سے نہیں لائے؟"

"یہ داملا بخاری کون صاحب ہیں؟ مجھے ان کے دستر خوان سے کیا واسطہ؟"

"وہی داملا بخاری جو سمرقند کے شمال مشرق میں میمین قشلاق میں رہتے ہیں، کیا تم وہاں نہیں گئے تھے اور اب کیا شہر سبز اپنے ماموں کے پاس نہیں جا رہے؟" بڑے میاں نے کہا۔ مُسکراہٹ ان کے پورے چہرے پر بکھر گئی تھی۔

مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ پیر مرد یا تو کمونسٹ پارٹی کا آدمی ہے اور میرے پیچھے لگا ہوا ہے یا مجاہدین کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑے میاں نے بدستور مسکراتے ہوئے چائے دانی اٹھائی اور چلے گئے۔ پانچ چھ منٹ کے بعد واپس آئے۔ کہنے لگے:

"کل بخارا میں بڑا ہی ظلم ہوا۔ بے شمار بے گناہ لوگ مارے گئے، لیکن یہ تو ابھی ابتدا ہے، دیکھیے انجام کیا ہوتا ہے۔"

پھر اچانک پوچھا: "کیا عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟"

مَیں نے اثبات میں جواب دیا، تو بولے: "آج رات تین بجے لوکل ٹرین قرشی جائے گی اس میں سوار ہو جانا۔"

بڑے میاں کی ہر بات حیران کن تھی اس کا مطلب یہ تھا وہ میرے سفر کے ایک ایک مرحلے سے واقف ہیں۔ مَیں جواب دینے کے بجائے چپ چاپ ان کی طرف دیکھتا رہا، پھر وہ چلے گئے۔ کوئی آدھ ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے، ایک کاغذ سا مجھے دیا، کہنے لگے:

"یہ لو قرشی کا چیتپہ (ٹکٹ)۔"

"اب مجھے اطمینان ہوا۔ بڑے میاں مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔ خیالات کی ایک رَو ذہن میں دوڑ گئی۔ بخارا میں افغان مُستشار کا جو ترجمان مجھے ملا تھا، وہ بھی مجاہدین ہی کا آدمی تھا۔ شاید اسے میرے بخارا پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی اور جس طرح بڑے میاں نے کلچے کے ایک ٹکڑے سے پہچان لیا تھا، اسی طرح اس نوجوان نے بھی مجھے کسی ایسی ہی علامت سے پہچان لیا ہو گا۔ تبھی تو وہ بڑی بے تکلفی سے ملا تھا جیسے بڑا پرانا آشنا سا ہو۔ پھر تصور ہی تصور میں مَیں پہاڑوں میں جا نکلا جہاں مجاہدین گزشتہ گیارہ بارہ برس سے کمونسٹوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ بڑے میاں خاموش کھڑے میرے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھتے رہے۔ پھر مَیں خیالات کی دُنیا سے اُبھرا اور جُرأت کر کے پُوچھا:

"داملا بخاری کس حال میں تھے؟"

بڑے میاں ہنس پڑے اور بولے: "قاری ملای درست است۔"

پھر یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے: "قرشی، غذار، کتاب اور شہر سبز میں حالات ابھی معمول پر ہیں۔ قرشی میں ایک قیزیل چائے خانہ (سُرخ ریستوران) ہے، اسٹیشن کے بالکل قریب۔ اس چائے خانے میں ٹھہرنا۔ چوروں میں پناہ لوگے، تو یقین نصیب ہو گا۔"

مَیں نے چیتپہ (ٹکٹ) اور چائے کے پیسے دیے جو بڑے میاں نے لے لیے۔ کہنے لگے: "یہ تمہارے حساب میں جمع کر دیے جائیں گے۔" پھر فی امان اللہ کہا اور رخصت ہو گئے۔

رات پونے تین بجے مَیں اسٹیشن پر پہنچا۔ مسافر خانہ بھرا ہوا تھا۔ ٹکٹ گھر کے آگے لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔

میرے پاس تو ٹکٹ موجود تھا۔ مَیں پلیٹ فارم کی طرف بڑھا۔ دروازے پر ایک سُرخ فوجی کھڑا تھا۔ مجھے روک کر چلایا:

"پرمٹ، پرمٹ، شفنتہ کوی:" (پرمٹ دکھاؤ، کہاں جاؤ گے۔)

مَیں نے انجان بن کر وہی ٹکٹ دکھا دیا۔ اللہ نے میری مدد کی۔ سنتری نے دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی، ٹکٹ کو پرمٹ سمجھا اور مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ گاڑی ٹھیک تین بجے آئی اور پانچ منٹ ٹھہری۔ ہر ڈبے کے دروازے پر ایک فوجی سٹین لیے کھڑا تھا۔ ہمارے ہاں ٹکٹ پر ڈبے کا نمبر لکھا ہوتا ہے، لیکن میرے ٹکٹ پر کوئی نمبر نہ تھا۔ مَیں ایک ایک دروازے پر پہنچا، مگر کسی فوجی نے اندر جانے نہ دیا۔ اسی تگ و دو میں گاڑی چل پڑی اور دروازے بند ہونے لگے۔ مَیں نے ایک فوجی کی منت سماجت کی، اسے ترس آ گیا، وہ ذرا ایک طرف ہوا اور مَیں اُوپر چڑھ گیا۔ میرے پیچھے چھ روسی جیب کترے بھی ڈنڈے کے ساتھ لٹک گئے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی، تو روسی ڈبے کے اندر آ گئے۔

ڈبے میں تین برتھ تھے جن پر تین اُزبک بیٹھے تھے۔ شرقی بخارا کے بارعب چہرے، لمبے قد، شکے جیسے سر، میری کلائی کے برابر موٹی موٹی اُنگلیاں، لمبے چُغے اور ایک ایک تھان کھدر کی بھاری بھرکم دستار۔ اچانک پیچھے کے چھ روسی بدمعاش مجھ پر پل پڑے اور میرا سامان چھیننے اور مجھے اُٹھا کر باہر پھینکنے کی کوشش کرنے لگے۔

مَیں مدد کے لیے پکارا، مگر ان اُزبکوں میں سے کوئی بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ روسی مجھے بے تحاشا پیٹ رہے تھے اور مَیں چیخ چلّا رہا تھا۔ روسی بدمعاش سب کے سب ہٹے کٹے اور گٹھیلے جسم کے تھے۔ ایک نے پُوری قوت سے میری گردن پر مُکہ مارا۔ میرا سر جھکرایا اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ بے اختیار چلّایا:

"اے اللہ، میری مدد کر۔"

خدا کا نام زبان پر کیا آیا، روسی بدمعاش اور بپھر گئے۔ ایک نے ماں کی فحش گالی دی اور چیخا:

"روحانی سبوک" (روحانی کتّے) اور پھر سب نے لاتوں اور مُکّوں کی بارش کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ گالیوں کی گردان شروع ہو گئی "تیرے دین پر۔ . . . تیرے خدا پر . . . . تیرے قرآن پر" . . . . مَیں نے ہر چند مقابلہ کیا، مگر وہ چھ تھے اور میں تن تنہا۔ انہوں نے مجھے گرا لیا اور میری ٹانگیں اور بازو پکڑ کر کھڑکی سے باہر پھینکنے لگے۔ اچانک ساتھ والے ڈبّے کا دروازہ کھلا اور کنڈکٹر ہاتھوں میں بتّی لیے نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی روسی بدمعاش دوسرے ڈبّوں کی طرف رفوچکر ہو گئے۔ مَیں نے کنڈکٹر کو ساری بپتا سنائی، وہ مجھے ساتھ والے کمرے میں لے گیا اور اُوپر کی ایک برتھ پر بٹھا دیا۔

میرے جسم کا رُواں رُواں دُکھ رہا تھا۔ مُکّوں اور تھپڑوں سے مُنہ سُوج گیا تھا۔ ڈبّے میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ماجرا پوچھا، مَیں نے ساری داستان کہہ سنائی۔ پتہ چلا کہ یہ تو روسی چوروں اور لفنگوں کا ڈیرہ ہو چکا ہے۔ گاڑیوں میں لُوٹ مار عام ہو چکی ہے۔ جسے چاہتے ہیں لُوٹ لیتے ہیں اور اُٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیتے ہیں۔ کوئی داد رسی نہ فریاد، اُلٹا فریادی مُجرم قرار پاتا ہے۔ کسی شخص کو بیچ بچاؤ اور مظلوم کو چھڑانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ شنوائی یا تو کمونسٹ پارٹی کے ممبروں کی ہوتی ہے یا کمسولوں (نوجوانوں کی کمونسٹ تحریک کے ارکان) کی۔ ان لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ تم اپنے آپ کو کمسول ظاہر کرو، ورنہ اُلٹا تمہی مجرم ٹھہرو گے۔ مَیں نے کہا:

"یہ تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد ریلوے پولیس کے دو سپاہی اور کنڈکٹر تین بدمعاشوں کو پکڑ لائے۔ بیانات ہوئے، چنانچہ مجھے روحانی قرار دینے کے بعد انہیں چھوڑ دیا گیا۔

(۳)

صبح سویرے قرشی کے اسٹیشن پر اُترا۔ شہر جاتے ہوئے دو قازقوں کا ساتھ ہو گیا۔ یہ قازق قوم پرست موتورین میں سے تھے، یعنی وہ لوگ جنہوں نے روسی کمونسٹوں کے چنگل سے نجات پانے کے لیے قازقستان میں تحریک شروع کر رکھی تھی۔ ان میں سے ایک صاحب بہت اُونچے پائے کے وکیل تھے۔ میری داستان سُن کر بڑی شفقت اور ہمدردی سے پیش آئے اور مجھے اپنے ساتھ شہر کے سُرخ ریستوران میں ٹھہرایا۔

اسی دن شام کو پانچ بجے ریلوے میدان میں ایک فوجی اجتماع ہوا۔ دراصل قرشی کے ایک مشہور عالمِ دین کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ شہر بھر میں منادی کی گئی اور عوام کو حکم دیا گیا کہ وہ مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لیے جمع ہوں۔ فوجی جتھا کوئی اسّی نوّے فرانسیسی سُرخ فوجیوں پر مشتمل تھا۔ میدان کے ایک کنارے عدالت کا اجلاس ہوا۔ لوگ دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان مُردِ حق کو زبردست فوجی پہرے میں لایا گیا۔ ان پر الزام یہ تھا کہ وہ عوام کا پرچار اور کمونزم پر تنقید کرتے ہیں۔

"میرا جرم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دعوتِ دین کا جو فرض مجھ پر عاید ہوتا ہے، اُسے مَیں نے انجام دیا، معترضین کو دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور یہ کام میں بہر حال زندگی بھر جاری رکھوں گا۔" والملا قرشی نے جواب دیا۔

"تم جسے فرض کہتے ہو، وہ خلافِ قانون اور بغاوت ہے۔ رُوحانیت کا پرچار قانوناً ممنوع ہے۔" فوجی جج غرّایا۔

"دینِ برحق، یعنی خدا، رسولؐ، آسمانی کتب، فرشتے، زندگی بعد موت، خدائے واحد کے آگے اعمال کا حساب کتاب اور دنیوی زندگی کی جوابدہی ایسے ٹھوس عقائد پر ملک کے عام باشندے ایمان رکھتے ہیں۔ کمونسٹ نصف فی صد سے بھی کم ہیں اور وہ بھی آئے دن تطہیر کے چکر میں مجرم اور باغی قرار پاکر ٹھکانے لگتے رہتے ہیں۔ ملک کی اکثریت اپنا دین نہیں چھوڑ سکتی......"

کمونسٹوں میں حق کی آواز سننے کی تاب کہاں تھی، ابھی اِس مردِ مجاہد نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ تھری ناٹ تھری کی گولیوں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا۔

میں نے دیکھا پورا مجمع فوج کے گھیرے میں تھا۔ عوام نہتے تھے، لیکن جب انہوں نے اس مردِ مجاہد کو گرتے دیکھا، تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میدان نعروں سے گونج اُٹھا...... مشین گنوں کا رُخ یکایک عوام کی طرف مُڑ گیا۔ گولیاں اولوں کی طرح برسنے لگیں۔ بعض بہادروں نے جان پر کھیل کر سُرخ سپاہیوں سے رائفلیں اور مشین گنیں چھین لیں اور پھر دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مزید فوج پہنچ گئی جس نے ریلوے اسٹیشن، وسطِ شہر اور ریلوے گودام کے پاس ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پورے شہر پر بھیانک خاموشی چھا گئی۔ مَیں مال گاڑی کے ایک ڈبے میں چھپ گیا تھا۔ میدان خالی ہو گیا، تو باہر نکلا اور چھپتا چھپاتا ریستوران پہنچا۔ میرے دونوں ساتھی بے حد متفکر تھے۔ مجھے دیکھ کر سکون کی لہر اُن کے چہرے پر دوڑ گئی۔

اس روز سُرخ فوج کی گولیوں سے قرشی میں کتنے لوگ شہید ہوئے، اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ بہت مشکل ہے۔ شہر میں مختلف افواہیں تھیں۔ بہر حال یہ تعداد سینکڑوں تک پہنچتی تھی۔

قرشی میں ہم تین دن رہے۔ چوتھے روز رات کے وقت شہرِ سبز کی طرف روانہ ہوئے۔ میرے ساتھی کہنے لگے:۔ "وہاں ابھی تک امن امان ہے، لیکن آخر کب تک؟ قرشی پر قابو پا لیا گیا، تو وہاں بھی یہی خونیں ڈرامہ کھیلا جائے گا۔"

قرشی کے اس قتلِ عام کے متعلق رُوسی اخبارات میں ایک لفظ تک شائع نہ ہوا۔ اس کے باوجود یہ اندوہناک خبر پھیل گئی اور ہر جگہ مسلمانوں کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ قرشی میں ابھی تک سخت کشیدگی پھیلی ہوئی تھی۔ جب مَیں غذار کی طرف روانہ ہوا، تو سُرخ فوج پورے شہر کا محاصرہ کرنے میں مصروف تھی۔

(۴)

قرشی سے مَیں غذار پہنچا اور غذار سے شہرِ سبز۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہے۔ چاروں طرف فصیل ہے۔ قرشی سے تقریباً ۳۶ کوس کے فاصلے پر ہے۔ ریلوے اسٹیشن سے شہر کے مرکزی دروازے کا فاصلہ تقریباً سات میل ہے۔ مَیں نے فصیل سے ملحق ایک بڑی مسجد میں قیام کیا۔ مسجد کیا تھی، ایک بہت بڑی سرائے تھی۔ صحن میں ایک چھوٹی سی نہر گزرتی تھی۔ ایک طرف عظیم الشان حمام تھے، دوسری طرف باغیچہ۔ نہر کے دونوں کناروں پر ہرے بھرے درخت لگے ہوئے تھے۔ باغیچے کے ساتھ ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں تقریباً پانچ سَو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ مسجد کے دونوں طرف حجرے تھے۔ مختصر یہ کہ مسجد بڑی دلکش اور حسین تھی۔

اسٹیشن سے شہر تک کا سفر تانگے میں کیا۔ اڈّے پر پہنچا تو ایک نسوار فروش سے حضرت خوقندی یعنی ماموں جان کا پتہ دریافت کیا۔ اُس نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی، تانگے والے کو کرایہ ادا کیا اور میرا سامان اُٹھا کر اپنی دُکان کے بالاخانے میں لے آیا۔ مجھے بٹھایا"

خود قیماق چائے بنوالایا۔ ترکستانی اپنے معزز مہمانوں کی تواضع قیماق چائے سے کرتے ہیں۔ یہ چائے ایک پاؤ دودھ، نصف پاؤ گھی، نصف پاؤ بادام، پستہ اور اخروٹ وغیرہ کے مغز، نصف چھٹانک سبز چائے اور ایک گلاس پانی سے بنتی ہے اور مہمان کو پراٹھے کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

چائے پی چکا تو دُکاندار نے پُوچھا:

"آپ تورہ حضرت کے عزیز ہیں؟"

"آپ نے کیسے اندازہ کیا؟"

"شکل وصورت اور عادات واطوار سے۔"

"خوقندی حضرت میرے ماموں ہیں۔" مَیں نے کہا۔

"آپ پہلے بھی کبھی آئے ہیں؟"

"نہیں، پہلے کبھی آنا نہیں ہوا، نہ ماموں حضرت کو دیکھا ہے۔"

"سیدھے آرہے ہیں یا راستے میں رُک گئے تھے؟"

"تین ماہ سے زیادہ عرصہ ہوا گھر سے نکلا۔ خوقند، سمرقند، بخارا، کاگان، قرشی اور غذار ہوتا ہوا یہاں پہنچا ہوں۔"

"قرشی سے کب نکلے؟"

"کل شام"

"آپ رات بھر نہیں سوئے ہوں گے آرام کیجیے۔ جب تک مَیں نہ آؤں باہر نہ نکلیے۔"

"بُرے پھنسے۔" مَیں نے دل ہی دل میں کہا۔ شاید اُس نے میرے چہرے سے دل کا خوف بھانپ لیا، کہنے لگا:

"شہر میں کل سے سُرخ فوج گشت کر رہی ہے۔ خوقندی حضرت کے قلعے پر تو بھاری پہرہ بٹھا دیا گیا ہے۔ میرا نام تیمر بیگ ہے اور خوقندی حضرت کا ادنیٰ خادم ہوں۔"

"آخر یہ سب کس لیے ہوا؟" مَیں نے پُوچھا۔

"بخارا میں بہت ظلم ہوا۔ قرشی میں ایک بہت بڑے عالم مفتی خالمراد داملا کو سُرخ فوج نے گولی مار دی۔ اگرچہ مسلمان قوتِ مدافعت سے بالکل محروم ہو چکے ہیں پھر بھی گھر گھر تلاشی لی جا رہی ہے۔ صرف صحرائی اور میدانی علاقے اب تک بچے ہوئے ہیں۔۔۔۔ یہاں ایک افغانی عالم اور پیر سید جلال الدین ہے۔۔۔۔"

"آپ اُنہیں جانتے ہیں؟" مَیں نے بات کاٹ کر پُوچھا۔

"ہاں، وہ غذار میں رہتا ہے، خوقندی حضرت سے قریبی تعلقات ہیں، ہر ہفتے آپ کی زیارت کے لیے پچیس تیس دیو انگیز (عظیم الجثہ دیو قامت) مُریدوں کے ساتھ آتا ہے۔ دو دو، تین تین دن تک حضرت کے لنگر خانے سے بہرہ یاب ہوتا ہے، مگر۔۔۔۔ وہ ایسا آدمی ہے۔۔۔۔"

دُکاندار بات کرتے کرتے چُپ ہو گیا۔

"کیسا آدمی ہے؟" مَیں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے دریافت کیا۔

تیمر بیگ کے ماتھے پر بل پڑ گئے جیسے مَیں نے کوئی بہت ہی ناگوار بات پُوچھ لی ہو، پھر بولا:

"تورہ زادے، اِس سوال کا جواب مَیں کل دُوں گا۔ اب حضرت کے قلعے کی طرف جاتا ہوں، ممکن ہوا، تو آپ کے آنے کی اطلاع کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ مَیں تخت پر دراز ہو گیا۔ کئی دنوں کا تھکا ماندہ بھی تھا اور پریشان بھی۔ اب جو قدرے پُرسکون فضا میسر آئی، لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ شام کے قریب تیمر بیگ لوٹا اور مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ خبر دی کہ خوقندی حضرت کو گھر پر نظر بند کر دیا گیا ہے، چنانچہ شہر اور دیہات میں کوئی مسلمان کام پر نہیں گیا۔ دُکانیں بند ہیں، سُرخ فوجی باؤلے کُتوں کی طرح بازاروں میں گھوم رہے ہیں۔ عوام کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائر کر رہے ہیں۔ آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ مَیں نے ایک بڑی مسجد میں آپ کی رہائش کا انتظام کر دیا ہے۔ وہاں کے امام اور مدرس خوقندی حضرت کے ایک ساتھی ہیں۔۔۔۔ ایک بات اور، وہاں آپ سے کوئی آنے کا سبب پُوچھے، تو کہہ دیں کہ مَیں متولّی صاحب کا گماشتہ ہوں اور غذار میں اُن کی جو املاک ہیں، اُن کا منصرم ہوں، باقی باتیں مجھ پر چھوڑ دیں۔

بعدازاں پتہ چلا کہ تیمیر بیگ، ماموں جان کا خاص آدمی تھا اور اُن کی طرف سے مسجد کا بندوبست کرتا تھا۔

نمازِ مغرب کے بعد تیمیر بیگ مجھے "کتہ مسجد" میں چھوڑ آیا اور ایک حجرہ رہنے کو دے دیا۔

(۵)

اسی رات مسجد میں مجلسِ مشاورت منعقد ہوئی۔ فرقۂ (کمونسٹ پارٹی) نے تمام بڑی بڑی مسجدوں کے متولیوں کے نام ایک سرکلر جاری کیا تھا جس میں اُن سے کہا تھا کہ فلاں تاریخ کو نمازِ مغرب کے بعد سے صبح کے آٹھ بجے تک کے لیے مسجدیں فرقے کے حوالے کر دی جائیں، وہاں وہ کوئی خصوصی پروگرام کرنا چاہتے ہیں۔ طویل غور و فکر کے بعد طے پایا کہ فرقے کے اس حکم کے خلاف پولیس کمیسارئٹ میں شکایت کی جائے۔ ایک احتجاجی قرارداد بھی منظور کی گئی۔ یہ قرارداد کسی اخبار میں جگہ نہ پاسکی۔ پولیس کمیسارئٹ نے شکایت پر کوئی باضابطہ کارروائی نہ کی، بس بڑے غیر ذمہ دارانہ طریقے سے کہہ دیا کہ فرقے کے احکام کو نہ شہری سوویٹ رد کر سکتی ہے نہ کمیسارئٹ۔

سرکلر جاری ہوئے چوتھا دن تھا۔ کمونسٹ پارٹی نے نمازِ مغرب کے بعد تمام بڑی مسجدوں میں بیک وقت جلسے منعقد کیے۔ اہلِ محلّہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی پردہ نشین بہو بیٹیوں اور بیویوں کو لے کر مسجد میں آئیں۔ مسلح پولیس کے سپاہی ایک سُرخ فوجی کی سرکردگی میں ایک ایک گھر پر گئے اور عورتوں اور مردوں کو جانوروں کی طرح ہانک لائے۔ مسجد کے دروازے پر دائیں بائیں دو کمونسٹ کھڑے تھے (یہ سب لوگ باہر سے آئے تھے) اور مستورات کے سروں سے بُرقعے، چادریں اور دوپٹے اُتار اُتار کر مسجد کے صحن میں ڈھیر کرتے جاتے تھے۔ رات کے دس بجے سب لوگوں کی موجودگی میں اس ڈھیر کو آگ لگادی گئی۔ اس کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ مقرر یکے بعد دیگرے پردے کے خلاف آتشیں تقریریں کرتے اور مُنہ سے جھاگ اُڑاتے رہے۔ ایک باشقرستانی یہودی کمونسٹ کا تعارف اِن الفاظ میں کرایا گیا:

"یہ صاحب باشقرستان کی نجات دہندہ کمونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں اور ایک ہفتہ گزرا قرشی سے یہاں آئے ہیں۔" اُس نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"پردہ عورتوں پر مردوں کے ظلم کی نشانی ہے۔ اب عورتیں آزاد ہوگئی ہیں۔ وہ دفتر میں نوکری کر سکیں گی۔ فرغانہ کے غیور باشندے اس حقیقت کو پاچکے ہیں۔ ان کی عورتیں آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہو چکی ہیں، نکاح و طلاق کا جھنجھٹ بھی اب باقی نہیں رہا، وہ مردوں کے ظلم سے آزاد بڑے امن و سکون کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ کاش! اس وقت فرغانہ و سمرقند یا بخارا کے حالات سے واقف کوئی شخص یہاں ہوتا، تو میرے اس بیان کی تصدیق کرتا۔ یہ دین، خُدا، رسُول، قرآن، قیامت، حساب کتاب، فرشتے، دوزخ اور جنّت سب ڈھونگ ہیں جو روحانیوں نے قولاق (زمینداروں) اور سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر کے رچائے ہیں۔ اور تاق (کامریڈ) لینن اور سٹالن نے مکروفریب کے اس جال کو تار تار کر دیا ہے۔ ان کا پیغام تم لوگوں تک پہنچانے اور تمہیں صحیح راستہ دکھانے کے لیے پارٹی نے یہ جلسہ کیا ہے۔"

اس کی یاوہ گوئی ناقابلِ برداشت تھی، لیکن ایک اور کمونسٹ تو ساری حدیں پھاند گیا۔ منبر پر چڑھ کر بالکل بے لگام ہو گیا۔ جو مُنہ میں آیا بکتا رہا۔ اسی دوران میں محراب پر تھوک دیا اور پھر ناک سِنک دی۔ اچانک اس کی نظر طاق میں رکھے ہوئے قرآن مجید پر پڑی۔ بندر کی طرح اُچھلا، قرآن مجید اُٹھایا، مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہوا صحنِ مسجد میں پہنچا اور اُسے جلتے ہوئے بُرقعوں اور چادروں کی گرم راکھ پر زور سے پٹک دیا، پھر گلا پھاڑتے ہوئے چلّایا: ہم شہرِ سبز کے کمونسٹ عہد کرتے ہیں اب ہم خرافاتوں کو پنپنے نہیں دیں گے۔ جس طرح ہم نے بخارا، سمرقند اور فرغانہ میں روحانیوں کے مراکز پر فتح پائی ہے اور وہاں کے لوگوں نے از خود روحانیوں کے دجل و فریب کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اسی طرح یہاں بھی کریں گے۔

میری قوتِ برداشت جواب دے گئی، میں اُٹھ کر اس بکواس

کا جواب دینا چاہتا تھا کہ تیمیر بیگ بول اُٹھا:

"تم یہودی بچے ہو، یہ محلہ اور مسجد مسلمانوں کی ہے۔ اس شہر میں تمہارے چھ معبد ہیں، پہلے اُنہیں تو آگ لگاؤ تاکہ پتہ چل جائے تم سچے کمونسٹ ہو۔ تم کہتے ہو فرغانہ اور بخارا وغیرہ کے علما اور عام مسلمانوں نے کمونزم کو راضی خوشی ازخود قبول کر لیا ہے۔ تم جھوٹ بولتے ہو، میرے دعوے کا شاہد یہ نوجوان کھڑا ہے"۔

تیمیر بیگ نے میری طرف اشارہ کیا، مَیں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پُرجوش آواز میں بولا:

"باشقرستانی دوست نے جو کچھ کہا ہے اُس کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں۔ فرغانہ وغیرہ کے علما نے تو کمونسٹوں کے ان اتہامات کو چیلنج کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنا کہنا تھا کہ مسجد میدانِ کارزار میں تبدیل ہو گئی۔ شہر سبز کے غیور مسلمان بدمعاش کمونسٹوں پر ٹوٹ پڑے۔ فوراً ملیشیا کے چند سپاہی پہنچ گئے، جلسہ ختم ہونے کا اعلان کیا اور حکم دیا کہ لوگ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔

ہم لوگوں کے لیے یہ حیران کُن بات تھی۔ سُرخ سپاہی لوگوں کو خاک و خون میں نہلائے بغیر چلے جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ دراصل ہوا یہ کہ کمونسٹوں نے جو شیطانی ناٹک اس مسجد میں کھیلا تھا وہی دوسری مسجدوں میں بھی کھیلا، چنانچہ مسلمان بھر ملک اُٹھے کئی مسجدوں میں کمونسٹوں کے ساتھ شدید جھڑپیں ہوئیں اور جب سُرخ فوج کمونسٹوں کی مدد کو پہنچی تو مسلمانوں نے ان سے ہتھیار چھین کر باقاعدہ جنگ کی۔ اِس طرح سُرخ فوج اِدھر اُدھر اُلجھ کر رہ گئی اور کمونسٹ ہماری مسجد میں اُس سے کام نہ لے سکے۔

اگلے روز بارہ بجے کے قریب سُرخ فوج اپنی بارکوں میں چلی گئی، ماموں جان کا قلعہ بھی آزاد ہو گیا، یہ ایک بالکل خلافِ توقع بات تھی، درحقیقت کمونسٹ حکومت نے یہ ایک تجربہ کیا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی یہاں کے لوگوں کی معلومات کہاں تک ہیں۔ آیا وہ صرف کنوئیں کے مینڈک ہیں یا ملک میں رُونما ہونے والے واقعات سے بھی باخبر ہیں۔ وہ یہ بھی اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ یہاں کے مسلمانوں میں اپنے دین، تہذیب اور روایات کی مدافعت کا جذبہ ابھی کس حد تک باقی ہے۔ وہ یہ بھی پتہ لگانا چاہتی تھی کہ عوام کی عقیدت کا مرجع و مرکز کون ہے؟ مسلمان عوام اور علما میں کون کونسی کمزوریاں ہیں جن سے کام لیا جا سکتا ہے۔

ایسا تجربہ وہ یکے بعد دیگرے ہر علاقے میں کر رہی تھی۔ اس تجربے میں غیر معروف اور غیر اہم کمونسٹوں کو آگے رکھتی اور جب عوام پر اس کا سخت ردِعمل ہوتا، تو اعلان کر دیتی کہ اس واقعے سے کمونسٹ حکومت کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ چند غیر تربیت یافتہ افراد کی اپنی حرکت تھی، چنانچہ ایک آدھ کو عوام دُشمن قرار دے کر پھانسی بھی دے دیتی تاکہ عوام کمونسٹ حکومت کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ بھرپور وار کرنے کے لیے نئے طریقے اور ہتھکنڈے اختیار کرتی۔

فوج بارکوں میں چلی گئی، تو شہر کو سکون نصیب ہوا۔ اَب مَیں نے تیمیر بیگ سے کھُل کر باتیں کیں۔ پتہ چلا وہ ماموں جان کے سیاسی مشیر ہیں اور بخارا، سمرقند اور تاشقند تک کئی بار جا چکے ہیں۔ رات کے واقعے کا ذکر چھڑا تو بولے: "یہ لوگ اَب کوئی اور تجربہ کریں گے"۔ پھر وہ ماموں جان کا پتہ کرنے چلے گئے کہ ان پر کیا گزری۔ واپس آئے، تو چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ کہنے لگے:

"محلے کے چند یہودی کمونسٹ لڑکوں کی شکایت پر سُرخ فوج نے ان کی حویلی کی تلاشی لی۔ ان یہودیوں نے کہا تھا کہ یہ ایشان (پیر) عوام کا خون چُوستا ہے اور انہیں فرقے کے خلاف اُکساتا ہے۔ تلاشی پر حضرت کے کمرے میں دُھلے ہوئے کپڑوں کا ایک جوڑا، ایک جُوتا، بھیڑ کی رنگی ہوئی ایک کھال، ایک موٹا کمبل، ایک مٹی کی چائے دانی اور ایک تانبے کی کیتلی نکلی، یہ ان کا کُل اثاثہ تھا۔ مہمان خانے سے ایک رجسٹر ہاتھ آیا جس میں آمدنی اور مصارف کی تفصیلات درج تھیں۔

کتنا کہاں سے آیا، کون لایا، کس نے وصول کیا اور کہاں خرچ ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔ فوجی افسر پائی پائی کے حساب کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور اپنے آدمیوں سمیت چُپ چاپ واپس چلا گیا؛ تاہم یہ ابتدائی کارروائی ہے۔ دشمن کا ایک وار خالی گیا، اب وہ تورہ حضرت کو پھانسنے کے لیے دوسری تدبیر کرے گا۔"

ایک ہفتے کے بعد کمیساریٹ کی طرف سے منادی کروائی گئی۔ ڈونڈی پیٹنے والا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، گزشتہ ہفتے کمونسٹ پارٹی کے بعض خودسر افراد نے از خود بدمستی کی تھی، ان کو سزا دی گئی ہے۔ حکومت کا ان حرکتوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ حکومت لوگوں کے دینی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں چاہتی، البتہ اگر کسی شخص نے کمونسٹ پارٹی کا ممبر بننا چاہا، تو اس کو متعصب ملاؤں اور پیروں سے بچایا جائے گا۔

پتہ چلا کہ یہ ڈھنڈورا ان تمام مقامات پر پیٹا گیا جہاں شہر سبز کی طرح کمونسٹوں نے دریدہ دہنی اور یاوہ گوئی کا تجربہ کیا تھا۔

(۶)

تیمور بیگ نے مجھے ماموں حضرت کی خدمت میں پیش کیا، تو انہوں نے سینے سے لگا لیا۔ ماموں حضرت اسی برس کے تھے لیکن خاصے تنومند تھے۔ سُرخ و سفید رنگ، سفید ریش، بارُعب چہرہ، پُوچھا:

"تمہاری والدہ کا کیا حال ہے؟ اُن کے ساتھ کون ہے؟"

"تین مہینے پہلے جب مَیں اُن کی خدمت میں تھا، تو وہ زندہ تھیں، مگر حقوق سے محروم کر دی گئی تھیں۔" مَیں نے عرض کی۔

"حقوق سے محروم، وہ کیا ہوتا ہے؟" ماموں حضرت نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"جو شخص خدا، رسولؐ، جنت و دوزخ، یوم آخرت، آسمانی کتب اور فرشتوں پر یقین رکھتا ہے، وہ روحانی کہلاتا ہے، اُس کے شہری حقوق ضبط کر لیے جاتے ہیں۔"

... "یہ اللہ رب العزت کی طرف سے ہمارے کفرانِ نعمت کی سزا ہے۔" ماموں حضرت نے فرمایا اور خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد تیمور بیگ سے فرمایا: "حاجی خوقندی کو بلاؤ۔"

حاجی خوقندی کا نام یولداش تھا۔ جہاں دیدہ آدمی تھا۔ عرب، ترکی، ایران، افغانستان، ہندوستان کے علاوہ یورپ کی سیاحت بھی کر چکا تھا۔ انور پاشا کے قریبی ساتھیوں میں تھا اور اب ماموں حضرت کے باغات کا داروغہ اور زمینوں کا مختار تھا۔ حاجی خوقندی آیا، تو ماموں حضرت نے فرمایا:

"جلال الدین ایشان کو جلد لے کر آؤ۔" حاجی چلا گیا، کچھ دیر کے بعد واپس آیا اور اطلاع دی کہ سید جلال الدین لنگر آتا گئے ہوئے ہیں، کل یا پرسوں آ جائیں گے۔

حاجی خوقندی، قرشی سے اُسی روز آیا تھا۔ وہاں مسلمانوں پر جو بیتا پڑی، تفصیل سے بیان کی۔ اسی سے پتہ چلا کہ قرشی میں جس عالمِ دین کو گولی ماری گئی تھی، وہ بخارا کے مشہور مفتی داملا خالمراد تھے اور مسجد مغاک کے خطیب انہی کے شاگرد تھے۔

اگلے روز سید جلال الدین ایشان آ گئے۔ ماموں حضرت نے فرمایا: "سید، آپ تو فرماتے تھے سوشلسٹوں کا مقصد صرف غریبوں سے ہمدردی، تعلیم عام کرنا، آمدنی کی مقدار مقرر کرنا، ضرورت سے زائد زمین اپنے پاس نہ رکھنا، عورتوں کے حقوق محفوظ کرنا وغیرہ ہیں اور وہ تمام قوموں کی خود مختاری اور آزادی کے حامی ہیں۔"

پیر افغانی نے کہا:

"ہاں جناب، اب کمونسٹ کھُل کر سامنے آ گئے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ ان کی وہ باتیں محض دھوکا اور فریب تھیں۔ غذار میں مَیں نے وہی کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا جو حاجی خوقندی نے شہر سبز میں دیکھا۔"

اب مَیں نے افغانی مُستشار کی بھیجی ہوئی طویل رپورٹ پیش کی۔ پیر افغانی نے اسے پڑھا اور فرمایا:

"غذار میں ہم نے بچشم خود دیکھا ہے، اب پُورے مُلک کے حالات کی ترجمانی ہو گئی۔"

# ۳

پیرِ افغانی حضرت سید جلال الدین، ماموں حضرت سے بڑی پریشانی کے عالم میں رخصت ہوئے، کہنے لگے: "میں کچھ مدت کے لیے بخارا جانا چاہتا ہوں، زندہ رہا تو واپسی پر ملاقات ہوگی۔" تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد واپس آئے۔ انہوں نے صورتِ حال کا بنفسِ نفیس جائزہ لینے کے لیے بڑا لمبا دورہ کیا۔ شہر سبز سے کتاب اور کتاب سے کوہستانی علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے دروازِ پہنچے جو دریائے آمو کے منبع پر واقع ہے، پھر حصار، بالیسوں، لنگر آتا اور غذار ہوتے ہوئے قرشی گئے۔ جس شہر اور بستی سے گزرے، سوشلسٹوں کی اسلام دشمنی کی نئی داستان سُنی۔ قرشی سے بخارا کا قصد کیا، تو سوشلسٹ حکومت نے جانے نہ دیا، چنانچہ بخارا سے اپنے ایک معتمد ساتھی کو طلب کیا اور وہاں کے حالات سُنے۔ ڈیڑھ ماہ کے اس دورے نے پیرِ افغانی کی آنکھیں کھول دیں۔ انہیں کمونسٹوں نے باور کرایا تھا کہ سوشلزم یا کمونزم محض ایک اقتصادی نظام ہے، مذہب سے انہیں کوئی دشمنی نہیں، وہ تو خلقِ خدا کو اقتصادی بدحالی سے نجات دلانا اور سرمایہ داری کو مٹانا چاہتے ہیں۔ سید جلال الدین اُن کے اس دامِ فریب میں گرفتار ہو گئے۔ مُریدان سے دریافت کرتے حضرت، سوشلزم اور کمونزم کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ تو وہ یہی جواب دیتے کہ ان کا تعلق صرف مال و دولت کی مساوی تقسیم سے ہے، مذہب سے اُن کا کوئی واسطہ نہیں۔

اب جو جگہ جگہ اپنی آنکھوں سے اسلام اور دیندار لوگوں کا حشر دیکھا، تو کمونسٹوں کی اس فریب دہی پر اُن کا خون کھول اٹھا اور اُنہیں پتہ چلا کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہیں اور دکھانے کے اور۔ سوشلزم اور کمونزم ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، مارکسٹ نظریے کے مطابق خدا و مذہب کا تصور نہ صرف لغو ہے بلکہ انسان کے حق میں افیون کا کام کرتا ہے اور اس کا قلع قمع پارٹی کا اوّلین فریضہ ہے۔ لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ کمونسٹ ان کی تائید و حمایت حاصل کر کے اپنے چنگل ملتِ اسلامیۂ ترکستان کے جسد میں بہت گہرے گاڑ چکے تھے۔ اب انہیں اپنے ملک افغانستان کی فکر دامنگیر

ہوئی جہاں کمونزم کے گماشتے اُن کے نام پر اپنی دسیسہ کاریوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے افغانستان جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ وہاں کے مسلمانوں کو کمونسٹوں کے جعل و فریب سے آگاہ کر سکیں؛ چنانچہ ماموں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس دورے میں جو کچھ آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں سے سُنا تھا بالتفصیل بیان کیا۔ مسلمانوں کی بیچارگی اور دینِ اسلام کی کس مپرسی کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی آواز بھرا گئی، کہنے لگے:

"حضرت! ہجرت فرض عین ہو گئی ہے آپ بھی رختِ سفر باندھیں اور میرے ساتھ چلیں۔ آج تک آپ میری خاطر مدارت کرتے رہے ہیں اب میں آپ کی خدمت کروں گا۔"

ماموں حضرت بڑے سکون سے پیرِ افغانی کی باتیں سُنتے رہے پھر فرمایا:

"ترکستان کے علما اور خواص فیصلہ کر چکے ہیں وہ ہجرت نہیں کریں گے اپنے عوام کو نہیں چھوڑیں گے اور آخر دم تک اُن کے ساتھ رہیں گے۔"

پیرِ افغانی نے ماموں حضرت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور روتے ہوئے بولے:

"اب میں اپنی زندگی مسلمان مُلکوں کو اس خطرناک فتنے سے آگاہ کرنے کے لیے وقف کر دوں گا ــــ سلام اللہ علیکم۔"

پیرِ افغانی رخصت ہوئے، تو فضا بڑی بوجھل اور غمناک تھی۔

(۲)

اس سارے عرصے میں میں شہر سبزی میں تیمر بیگ کے پاس مقیم رہا۔ حالات بظاہر معمول پر آ گئے تھے، لوگ اطمینان سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ڈیڑھ دو ماہ پہلے کے خونیں واقعات ذہنوں سے محو ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا جیسے خلافِ اسلام اقدامات محض اتفاقی حوادث تھے۔ ان کے پیچھے نہ تو کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور نہ حکومت کا ہاتھ۔ سوشلسٹ حکومت نے مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لیے چند غنڈوں کو شوریدہ سر قرار دے کر سخت ترین سزا دے دی تھی، بعض کو پھانسی پر لٹکا دیا تھا، سادہ لوح اس فریب میں آ گئے۔ وہ سوشلسٹ حکومت کو بے قصور گردانتے اور کہتے کہ یہ چند سر پھرے بدمعاشوں کی کارستانی تھی، اگر حکومت کا اس میں ہاتھ ہوتا، تو وہ ان بدمعاشوں کو سزا کیوں دیتی؟

عوام کو مزید مطمئن کرنے کے لیے کمونسٹوں نے ایک ہتھکنڈا اور اختیار کیا۔ ہر شہر میں محلے وار کمیٹیاں قائم کیں۔ ان کمیٹیوں کا نام بھی عربی رکھا گیا۔ "اصحاب العدل" یعنی عادل اور انصاف پسند لوگ۔ بظاہر ان کا کام بڑا نیک تھا۔ یہ لوگ اہلِ محلہ کے باہمی جھگڑوں اور شکر رنجیوں کو دُور کرتے اور ان کے درمیان میل ملاپ کراتے۔ اس طرح بھولے بھالے عوام کو یہ تاثر دیتے کہ وہ تو بڑے انصاف پسند اور اچھے لوگ ہیں، فتنہ و فساد سے نفرت کرتے اور امن چاہتے ہیں، لیکن ان کا اصل مقصد محلے والوں کو کمونسٹوں کے دامِ فریب میں گرفتار اور کمونزم کے لیے زمین ہموار کرنا تھا۔ ان کمیٹیوں کے ارکان بالعموم محلے کے نامی گرامی اوباش اور ماں باپ کے نافرمان نوجوان ہوتے تھے۔ ایک ممبر کمونسٹ پارٹی نامزد کرتی اور وہی اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتا اور ان کی رپورٹ بڑی باقاعدگی کے ساتھ پارٹی اور پولیس کو بھیجتا۔ اگرچہ ان کمیٹیوں کی ہیئتِ ترکیبی انہیں بے نقاب کرنے کے لیے کافی تھی؛ تاہم سادہ لوح لوگوں کی کچھ کمی نہ تھی، وہ اس فریب میں مبتلا ہو گئے کہ ان کمیٹیوں کے ذریعے ایک اچھے کام کا آغاز ہو گیا ہے۔ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ان کی اس خوش فہمی کا پردہ چاک ہو گیا اور وہ اپنے معاملات ان کے پاس لے جانے سے گریز کرنے لگے۔

پارٹی کی ہدایات کے مطابق ان کمیٹیوں نے اپنے اپنے محلے کے باشندوں کو تعلیم، فکر و ذہن اور عقیدے کی بنیاد پر مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا، پھر بڑے وسیع پیمانے پر یہ جائزہ لیا کہ ان مردوں اور عورتوں میں سے کون حکومت کے کام کا ہے، کون پارٹی کے راستے میں رُکاوٹ بن سکتا ہے، کس کو زور و زر اور ترغیب و تہدید

سے قابو میں لایا جا سکتا ہے اور کون لوگ ایسے ہیں جو کسی صورت قابو میں نہیں آ سکتے۔ کمیٹیوں نے لوگوں کے باہمی تعلقات، دوستیوں اور دشمنیوں کی چھان بین بھی کی اور ایسی تدابیر بھی سوچیں جن کے ذریعے ان کے اندر انتشار و افتراق پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ "اصحاب العدل" کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ علما پر نظر رکھیں اور ان کے متعلق تمام ضروری معلومات پولیس اور پارٹی کو فراہم کریں۔ اصحاب العدل نے اپنے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیے۔ جلد ہی ہر شہر اور ہر محلے میں ایک ایک شخص کے بارے میں مکمل معلومات پولیس اور پارٹی کے دفتر میں جمع ہو گئیں۔ ہر شخص کی فائل مکمل ہو گئی جس میں اس کا نام، حسب نسب، رشتہ داروں کے نام، پیشہ، تعلیم، خیالات اور پسندیدگی حتیٰ کہ مزاج اور طبیعت کی ساخت اور طور اطوار تک کا تذکرہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان کمیٹیوں کی کارکردگی کے نتائج سامنے آنے لگے۔ کونسلوں کے اردگرد دو قسم کے افراد جمع ہو رہے تھے۔ ایک تو اوباش، لاابالی، بے علم اور جاہ پسند لوگ جن کا کام ہی دوسروں پر رعب گانٹھنا ہوتا ہے۔ دوسرے عالم دین اور صوفی کہلانے والے وہ "بزرگ" جن کا علم محدود، سوجھ بوجھ بالکل سطحی اور کردار بے حد کمزور اور بودا تھا۔ لینن نے ایک بار کہا تھا:

"مشرق میں مذہب کے دروازے سے آؤ۔" اس ہدایت پر یہاں ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا تھا۔ ترغیب و ترہیب اور مختلف ہتھکنڈوں سے ہر جگہ چند مذہبی لوگوں پر قابو پا لیا گیا۔ ان میں بڑے بڑے زاہد و عابد، صوفی اور ملا تھے۔ شکل صورت میں مومن قانت، چہروں پر بڑی بڑی ڈاڑھیاں، پیشانیوں پر چمکتے ہوئے سیاہ گٹے۔ یہ لوگ ایک طرف سوشلزم اور کمیونزم کی حمایت میں قرآن و حدیث کے حوالے دیتے اور صحابۂ کرامؓ کی زندگیاں پیش کرتے، دوسری طرف سوشلزم کے مخالف علما کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ایجنٹ قرار دیتے۔ اس طرح جن علاقوں میں علما اب تک بنیانٌ مرصوص بنے اسلام کا دفاع کر رہے تھے، وہاں بھی انتشار پھیل گیا۔ عام مسلمان دو مکتبوں میں بٹ گئے۔ مسلمانوں کی دینی و تہذیبی زندگی پر کمیونسٹوں کے حملوں کی مزاحمت کو شدید نقصان پہنچا۔

ان کمیٹیوں کے حقیقی خدوخال کا پتہ مجھے ایک گاؤں یعقوب چرخی کے ایک امام صاحب سے چلا۔ یہ گاؤں شہر سبز سے تقریباً ۱۶ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کے لوگ قبیلۂ کنا کاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان دنوں ہم چار طالب علم شہر سبز کے گرد و نواح کا دورہ کر رہے تھے۔ جب ہم یعقوب چرخی پہنچے، تو امام صاحب کسی شادی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ کوئی آدھی رات کے قریب واپس آئے۔ مسجد ہی میں ملاقات ہوئی، بڑے تپاک سے ملے جب انہیں پتہ چلا کہ میں حضرت خوقندی کا خواہر زادہ ہوں، تو ان کی اس گرمجوشی میں عقیدت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا۔ امام صاحب نے اپنی داستانِ مصیبت بڑی تفصیل سے بیان کی، کہنے لگے:

"ہم تو حالات پر خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔ میں اس مسجد کے علاوہ چار اور مسجدوں کا امام بھی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس طرح کہ لوگ اب نماز نہیں پڑھتے، بس شادی بیاہ، موت فوت اور جنازے وغیرہ کے موقع پر امام کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے فصل کٹنے پر گندم وغیرہ مل جاتی تھی، اب چار پانچ سال سے کونسلوں نے امام مسجدوں کے لیے فصل کا مخصوص حصہ کم کر دیا ہے، چنانچہ پانچ مسجدوں کی آمدنی مل کر بھی پوری نہیں ہوتی اور فاقوں پر فاقے کرنا پڑتے ہیں۔" امام صاحب نے کہا۔

آدھی رات گزر چکی تھی، ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ میرے تینوں طالب علم ساتھی صحرا کے باشندے تھے۔ ان کی دنیا لیس شہر سبز تک محدود تھی۔ انہوں نے اخبار کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ انہیں نہ تو گرد و پیش رونما ہونے والے سیاسی واقعات سے کوئی دلچسپی تھی، نہ وہ کبھی کسی مجلس میں شریک ہوئے تھے۔ ہماری گفتگو ان کی سمجھ سے بالاتر تھی، چنانچہ وہ سو گئے۔

"آؤ صحنِ مسجد میں چل کر بیٹھیں تاکہ ان لوگوں کے آرام میں خلل نہ ہو۔" امام نے کہا، چنانچہ ہم دونوں باہر صحنِ مسجد میں بیٹھ

گئے اور باتیں ہونے لگیں۔ امام نے بتایا:

"ڈیڑھ دو ماہ پہلے حکومت نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں محلے وار کمیٹیاں قائم کی تھیں، ایک کمیٹی یہاں بھی قائم ہے۔ دوسرے شہروں کے متعلق تو مجھے کچھ خبر نہیں، ہمارے گاؤں کی کمیٹی میں سب کے سب اوباش اور چھٹے ہوئے غنڈے شریک کیے گئے ہیں، ایک شخص بھی معقول نہیں ہے۔ کسی کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا، چنانچہ اپنی تمام رپورٹیں مجھ سے لکھواتے ہیں، حالانکہ میں اس کمیٹی کا ممبر نہیں ہوں۔ مجھے ان لوگوں نے دھمکی دے رکھی ہے کہ کوئی بات باہر نکلنے نہ پائے، ورنہ اس کا خمیازہ بھگتو گے۔"

"آپ کو یہ لوگ کیا دیتے ہیں؟"

"کچھ نہیں، بس زبانی طور پر یہ ضمانت دے رکھی ہے کہ تمہیں حکومت کی طرف سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے گی۔ ہاں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمہارا نام روحانی لوگوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جائے گا۔"

امام صاحب خاصے سمجھدار تھے، از خود کہنے لگے:

"دین میں نئی نئی باتیں داخل کی جا رہی ہیں جن کا یہاں کبھی چلن نہیں رہا۔ حکومت ان باتوں کی حمایت کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص لوگوں کو ان سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کو مجرم گردانتی ہے کہ تم نے آزاد شخص کے ذہن کو مقید کرنے کی کوشش کی، تم مشتوم زور (غنڈے) ہو۔" امام صاحب نے مثال بھی دی — طوافِ قبور ہمارے ہاں کبھی مروج نہیں رہا، لیکن اب بڑے زور شور سے ہونے لگا ہے۔ اس کا آغاز کس طرح ہوا؟ یہ بھی سن لیجیے۔ گاؤں کے ایک آدمی نے خواب دیکھا کہ اس کے مرحوم مرشد فرما رہے ہیں ان کی قبر کا طواف کرو، چنانچہ اس نے طواف شروع کر دیا۔ قبر پر ایک مجاور رکھا اور زائرین کو بھی اپنے مرشدِ مرحوم کی وصیت سنائی اور انہیں طواف کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح سلسلہ چل نکلا۔ وہ شخص کون تھا، گاؤں کا سب سے بڑا بدمعاش اور "اصحاب العدل" کا سرگرم رکن۔ پہلے پہل لوگوں نے جب اسے ٹوکا، تو انہیں کمیٹی کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ کمیٹی نے سرزنش کی اور کہا کہ آئندہ لوگوں کی آزادیٔ فکر و عمل میں ٹانگ اڑائی تو جیل بھیج دیے جاؤ گے۔"

امام صاحب نے آہ بھری اور کہا:

"اس کمیٹی کو وجود میں آئے بمشکل دو مہینے ہوئے ہیں، لیکن کئی ضخیم رجسٹر بھر کر پولیس اور پارٹی کو بھیجے جا چکے ہیں۔ ان میں ایک ایک شخص کے کوائف درج ہیں۔ علما اور دیندار لوگوں اور ان کے ساتھ میل جول رکھنے والوں کے مکمل تعارف نے سب سے زیادہ جگہ لی ہے۔ ان کے حالات میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ کون کون لوگ ان کے مخالف ہیں اور ان مخالفین سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔"

میں نے ماموں حضرت کے متعلق دریافت کیا، کہنے لگے:

"ان جیسے بڑے لوگوں کے کوائف ان کے نام، ولدیت، پیدائش، مکمل پتے اور پیشے تک محدود رکھے گئے ہیں۔ علاقے کی کمیٹی کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے۔ آپ کے ماموں جان کو سخت خطرناک روحانی قرار دے دیا گیا ہے اور تمام کمیٹیوں کے نام حکم جاری ہوا ہے کہ ان سے ملنے جلنے والے لوگوں سے خبردار رہیں۔"

اب میں نے فرغانہ، سمرقند، بخارا اور قرشی وغیرہ پر جو کچھ گزری تھی، اس کی مکمل روداد کہہ سنائی۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ پیر افغانی سوشلسٹوں کے فریب سے آگاہ ہو کر افغانستان چلے گئے ہیں۔ امام صاحب حیرت سے بولے:

"یہ تو معجزہ ہوا۔ پیر افغانی، غازی امان اللہ خاں کا مرشد زادہ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا، سوشلسٹوں کا زبردست حامی ہی نہ تھا، بلکہ کہتا تھا سوشلزم انسان کو دنیا ہی میں اعلیٰ علیین (جنت) میں پہنچا دینے والا نظام ثابت ہوگا۔"

امام صاحب نے اگلے روز ہمیں بڑے شفقت بھرے جذبات کے ساتھ رخصت کیا۔

ٹھیک اس زمانے میں کمونسٹوں نے علما میں پھوٹ ڈالنے،

انہیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے اور ملکی حالات سے اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک نیا کھیل کھیلا۔ جو مُلا مولوی اُن کے آلۂ کار بن چکے تھے، وہ فروعی اختلافات کو ہوا دینے اور چھوٹے چھوٹے بے مقصد مسائل پر زورِ بیان صرف کرنے لگے۔ بے شک یہ اختلافات پہلے بھی موجود تھے اور سطحی ذہن اور کوتاہ نظر رکھنے والے مُلاّ ان میں اُلجھے رہتے تھے لیکن سمجھدار علما ہمیشہ ان سے دامن بچاتے اور مداخلت کرکے انہیں وسیع تر دائرے میں پھیلنے سے روک دیتے تھے۔ اب کے جو یہ نئے شروع ہوئی تو بڑھتی ہی چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یُوں نظر آنے لگا جیسے اِس ملک کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اسلام اور اسلامی زندگی کا گلا گھونٹنے کے لیے جو پنجۂ استبداد بڑھ رہا ہے، اُس سے کیسے نجات پائی جائے، بلکہ یہ ہے کہ جمعے کے بعد احتیاطِ پیشین ظہر پڑھنی چاہیے یا نہیں، محفلِ میلاد میں قیام جائز ہے یا ناجائز، نماز میں التحیات کے دوران انگشتِ شہادت اُٹھانی چاہیے یا نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ تھا یا نہیں، حضور کے والدین کو کافر کہا جائے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہر طرف معرکہ کارزار گرم تھا۔ جن مسجدوں میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت نہ تھی وہاں ان مسائل پر زور شور سے مناظرے ہو رہے تھے۔ کمونسٹوں کا یہ کھیل بے حد کامیاب رہا۔ علما کی خاصی بڑی تعداد اصل دشمن کو بھول کر آپس میں اُلجھ گئی اور عوام کی توجہ بھی "اصحاب العدل" کی کارستانیوں سے ہٹ گئی۔

(۳)

امام صاحب سے رخصت ہو کر دو طالب علم تو شہر سبز چلے گئے اور ایک میرے ساتھ رہا۔ ہم دونوں سری آسیا پہنچے جہاں میرے نانا مرحوم حضرت غیاث الدین ایشان کا مزار ہے۔ مزار کی زیارت کرکے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم پہاڑوں کی طرف بڑھے۔ پہاڑی سلسلوں کے پیچ و خم کھاتے ہوئے دروں اور دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑی آبادی میں پہنچے۔ یہاں کے لوگ قوی ہیکل، دراز قامت اور بارُعب تھے۔ یہ جگہ شہر سے صرف تین دن کی مسافت پر تھی مگر جیسے اس کے زمین و آسمان ہی نئے تھے۔ یہاں دین کی حقیقی رُوح جلوہ گر نظر آئی۔ مرد و زن، بچے بُوڑھے سب نمازی، متشرع، باادب، خلیق اور کم گو تھے۔ سلام کرنے میں پہل کرتے۔ عورتوں کے لیے ہر مسجد میں الگ حصّہ مخصوص تھا جہاں وہ فرض نماز باجماعت پڑھ کر گھر چلی جاتی تھیں۔ دن کے وقت کوئی عورت دکھائی نہ دیتی۔ مسجد سے متصل ایک وسیع مہمان خانہ تھا جس میں بستی میں آنے والے مسافر ٹھہرائے جاتے اور سب مل کر کھانا کھاتے۔ لوگوں کی زندگی بڑی سادہ اور تکلفات سے عاری تھی۔ گھروں میں مختصر سا سامان تھا۔ مسجد کے امام ہی پوری بستی کے امیر تھے۔ وہ مسجد میں نماز پڑھاتے، درس و تدریس کا فریضہ انجام دیتے، بیماروں کی عیادت کو جاتے، اُن کے علاج معالجے کا انتظام کرتے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے آدمی متعین کرتے۔ پُوری زندگی نہایت منظم اور مربوط تھی۔ جرم کا نام و نشان تک نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ اُن بستیوں میں سے ایک بستی ہے جنہوں نے نانا مرحوم حضرت غیاث الدین ایشان کی دعوتِ دینی کو پُوری طرح اپنا لیا تھا اور اب ان کے باشندے حضرت خوقندی (امام جان) سے وابستہ ہیں۔ مجاہدین کا علاقہ یہیں سے شروع ہوتا تھا جنہوں نے گزشتہ دس گیارہ برس سے کمونسٹ سامراجیوں کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ بستی کے دفاع کا بظاہر کوئی سامان نظر نہ آتا تھا۔ پتہ چلا کہ دشمن جونہی حملہ آور ہوتا ہے لوگ گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں چلے جاتے ہیں، تاہم مجاہدین کا اصل مرکز تختۂ قراچہ کے فلک بوس پہاڑوں میں بہت دُور واقع تھا۔

ہم دونوں نے رات مہمان خانے میں گزاری۔ اُس روز کوئی ایک سو سے زائد نوجوان اور بُوڑھے مرد جمع ہوئے۔ سب سے بُوڑھے شخص کی عُمر سو سال سے اُوپر تھی۔ اس نے ایک جزدان سے چند بوسیدہ اوراق نکالے۔ پہلے قرآن کی آیت اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، معوذتین (آخری دو سورتیں سورہ فلق اور سورہ والناس) اور کلمہ طیبہ و شہادت بلند آواز سے پڑھا جنہیں

سب لوگوں نے بلند آواز سے دُہرایا، پھر اُس عمر رسیدہ شخص نے بوسیدہ اوراق سے پڑھنا شروع کیا۔ عبارت ترکی زبان میں تھی چند فقرے مجھے آج بھی یاد ہیں:

"اے اللہ، ہمیں تیری معرفت تیرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے حاصل ہوئی۔ تیرے رسولؐ نے فرمایا کہ ہم صرف تیرے حکم کو مانیں، تیرے سوا کسی کے آگے اپنا سر نہ جھکائیں، اپنے ہم جنسوں کو نہ ستائیں، تیرے ماننے والوں کا احترام کریں، بڑوں کی عزت کریں اور چھوٹوں سے شفقت کے ساتھ پیش آئیں، ہمسایوں کے حقوق کا پاس کریں، رزق حلال کھائیں اور رزقِ حرام سے اجتناب کریں۔ اے خدا، ہم تیرے رسولؐ کے دوست کو اپنا دوست اور اُن کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھتے اور اپنے آپ کو تیرے حوالے کرتے ہیں۔"

مہمان خانے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ سب ہمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے۔ بڑے میاں پڑھ چکے تو حاضرین اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان بزرگ سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ہر ماہ کے آغاز میں اسی طرح جمع ہوتے ہیں اور اس عہد نامے کو کسی بھی سن رسیدہ بزرگ سے سُن کر منتشر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ہر مہینے ایک سچے مسلمان کی زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

(۴)

یہاں سے میرا تیسرا ساتھی بھی رخصت ہو گیا اور ایک نیا رفیق ہم سفر بنا۔ زادِ راہ کے طور پر بھیڑ کے دودھ سے نکالا ہُوا روغنِ زرد اور بُھنا ہوا سویق (دلیہ) ساتھ لیا اور روانہ ہو گئے۔ ان پہاڑیوں میں اسلامی عہد کی ایک سڑک تھی، دورِ انقلاب میں اسے جگہ جگہ سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اب اس پر جنگلی درخت اُگ آئے تھے، اس طرح راستہ بند ہو گیا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ ٹھنڈے شیریں پانی کے چشمے، گنگناتی ندیاں اور دلکش سبزہ زار ملے۔ پُورا خطہ جنت نظیر تھا۔ سرسبز لہلہاتی گھاس، اخروٹ اور چنار کے اُونچے اُونچے درخت، فضا میں اُڑتے ہوئے بٹیر، کالکیک، قرا بغر اور تیتر وغیرہ گوناگوں پرندے، سبزہ زاروں میں کلیلیں بھرتے ہوئے انواع واقسام کے ہرن، غرض ہر طرف قدرتی زندگی بہار پر تھی۔ ہمارا معمول تھا کہ دن بھر سفر کرتے، پرندوں کا شکار کر کے پیٹ بھرتے اور رات گزارنے کے لیے جنگل ہی میں پڑ رہتے۔ چھٹے دن عصر کے قریب ایک تراہے پر پہنچے۔ ایک راستہ ذرا زیادہ نمایاں تھا، اُسی پر ہو لیے۔ بیس پچیس منٹ کے بعد گھنا جنگل شروع ہو گیا اور پھر ایک بلند و بالا مضبوط قلعہ نظر آیا، اللہ کا شکر ادا کیا۔ ابھی کچھ دُور ہی گئے تھے کہ جنگل میں سے چند مسلح جوان نکل آئے۔ بعض تو گھوڑوں پر سوار تھے اور بعض پا پیادہ۔

"السلامُ علیکم!" ایک سوار نے بڑے باوقار لہجے میں کہا۔

"وعلیکم السلام!" مَیں نے جواب دیا۔

"کہاں سے آنا ہوا اور کدھر جا رہے ہیں؟"

"شہر سبز سے۔" مَیں نے کہا۔

"آپ تو شہر سبز کے نہیں لگتے، البتہ یہ دوسرا نوجوان شاید وہاں کا ہو گا۔" پہلے سوار نے ایک عجیب انداز میں کہا، اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم کھیل رہا تھا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے، مَیں دراصل فرغانہ کا رہنے والا ہوں اور یہ میرے ساتھی قزیل ایمچک کے ہیں۔"

"قزیل ایمچک میں آپ کسی شخص کو جانتے ہیں؟"

"نہیں، ویسے مَیں اس بستی میں تین دن مقیم رہا ہوں، لیکن میرا کوئی شناسا نہیں، نہ کسی کا نام جانتا ہوں۔" مَیں نے صاف صاف کہہ دیا۔

"شہر سبز میں کسی شخص کو جانتے ہیں؟"

"ہاں، تیمیر بیگ کو جانتا ہوں، مَیں انہی کا مہمان تھا۔" پھر تیمیر بیگ کا پُورا پتہ دیا۔

نوجوان نے میرا بھرپور جائزہ لیا اور کہا:

"ہاں، آپ نے میرے سوال کا پُورا جواب تو دیا نہیں، مَیں نے پُوچھا تھا: آنے کا مقصد کیا ہے؟"

"بس سیر سپاٹا اور قدرتِ خداوندی کا مشاہدہ۔"

نوجوان کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "تو گویا آپ قلعے کی سیر کرنے آئے ہیں؟"

"جی ہاں، مَیں قلعہ دیکھنا بھی پسند کروں گا۔"

نوجوان نے اپنے ساتھیوں سے اشارتاً کچھ کہا، وہ سب ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ صرف دو سوار اور چار پیادے ہمارے ساتھ رہ گئے۔ ایک سوار کو اس نے اپنے ساتھ لیا اور چلا گیا۔ مَیں نے اپنے ایک نگران سے پوچھا:

"آپ کون لوگ ہیں اور وہ نوجوان جو باتیں کر رہا تھا، کہاں گیا ہے؟"

"من ترکی نمی دانم" (مَیں ترکی نہیں جانتا)، اس نے بڑی محبت سے فارسی میں جواب دیا۔

مَیں تو یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ مجھے فارسی نہیں آتی، خاموش رہا، البتہ میرے ساتھی نے فارسی میں پوچھا: "تم کہاں کے ہو؟"

"بلجوان کا۔ انور پاشا کی شہادت کے بعد تقریباً سات آٹھ سال سے مَیں اس جنگل میں مقیم ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

کوئی گھنٹے بھر کے بعد نوجوان واپس آیا، میرے ساتھی کو رخصت کیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ قلعے کے دروازے پر پہنچے، تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ عمارت کے قریب پہنچ کر میرے گھوڑے کی گردن پر تقریباً ایک گز سفید کڑھا ہوا کپڑا ڈال دیا گیا۔ یہ شاید اس امر کی علامت تھی کہ میرا تعلق بھی انہی لوگوں سے ہے، اس لیے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ قلعے کے باہر دُور دُور تک گھنے جنگل میں مسلح نوجوان راستے کے دونوں طرف متعین تھے، مگر اس انداز سے کہ ان کے پہرے دار ہونے کا احساس نہ ہو۔

قلعے کے ایک غیر معروف اور خفیہ دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے..... اب ہم ایک بہت بڑے ہال میں کھڑے تھے۔ ادھیڑ عمر کے ایک باریش، قدآور، خم کلہ (بڑے سر والے) بارعب آدمی نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور حالات دریافت کیے، پھر پوچھا:

"تیمور بیگ ٹھیک ہو گیا ہے؟"

"جی ہاں،" مَیں نے جواب دیا۔

"کیا بیماری تھی؟"

ایک بار تو مَیں سٹپٹا گیا، تاہم سنبھلا اور کہا:

"ڈاڑھ میں درد تھا۔"

"ان ایسے چہروں کو اللہ محفوظ رکھے۔" مجاہدین کے امیر نے کہا۔

"آمین۔" مَیں نے بلند آواز سے کہا۔

ہال میں تقریباً پانچ سَو مجاہدین موجود تھے، سب کے سب رُوسی ہشت آثار (تھری ناٹ تھری کی رائفل) سے مسلح تھے، لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا، وہ ان لوگوں کی کمال درجے کی تنظیم اور خبر رسانی کا نظام تھا۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی میرا حلیہ، وضع قطع اور مکمل تعارف پہنچ چکا تھا۔ ملک میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے ہر آن باخبر رہتے تھے۔ ملک کے اندر پھیلے ہوئے تنظیمی مراکز اور اُن کے رہنماؤں کے ساتھ گہرا رابطہ قائم تھا۔ سمرقند اور دوسرے پہاڑی علاقوں میں کمونسٹ جب بھی مسلمانوں کو تنگ کرتے، یہ بگولا بن کر پہاڑیوں سے اُٹھتے اور ان بدمعاشوں پر ٹوٹ پڑتے۔ سب کے سب بلا کے نشانہ باز اور شہسوار تھے۔

باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا کہ یہ قلعہ تقریباً ایک ہزار مجاہدین کا مرکز ہے۔ بلند پہاڑوں کے اس پار افغانستان شروع ہو جاتا ہے، لیکن افغانستان سے متصل علاقے پر سُرخ فوج قبضہ کر چکی ہے، اس طرح یہ مجاہدین محصور ہو چکے ہیں۔ قلعے کا امیر بخارا کے مدرسے کا فارغ التحصیل عالم اور غازی انور پاشا کے محاذِ آزادیٔ ترکستان میں کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔ سب مجاہدین اخروٹ اور چنار وغیرہ کی بیش قیمت لکڑی کے نہایت نفیس قلمدان بناتے تھے جو بخارا، سمرقند اور افغانستان کے بازاروں میں خاصی قیمت پر فروخت ہوتے۔ امن کے زمانے میں یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔

امیر نے فجر کی نماز کے بعد میرا تعارف مجاہدین سے کرایا اور

وہ تمام حالات بیان کیے جن کی رپورٹ مَیں نے انہیں دی تھی۔ دورانِ گفتگو ایک عجیب سا جملہ انہوں نے کہا جسے مَیں نہ سمجھ سکا۔ شاید کوئی کوڈ ورڈ (CODE WORD) تھا۔ مجاہدین سب کے سب کھڑے ہو گئے اور سلیوٹ کیا، پھر امیر نے بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھا جسے سب نے دُہرایا۔ پتہ چلا کہ جب مجاہدین اللہ کی راہ میں مر مٹنے کا عہد دُہراتے ہیں، تو بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں۔

پھر دسترخوان بچھ گیا۔ وہی گھوڑی کا دودھ اور سویق سے تیار کردہ خوراک تھی جو رات کے وقت کھائی تھی۔ امیر نے مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔ کھانے کے دوران میں پوچھا: "اب کیا ارادہ ہے؟"

مَیں ابھی جواب نہیں دے پایا تھا کہ اچانک بولے:

"قرشی کے اسٹیشن پر آپ کا رُوسیوں سے تصادم ہوا تھا؟"

مَیں حیران رہ گیا اور اُن کا مُنہ تکنے لگا۔ وہ ہنسے، میرا کندھا تھپکا اور بولے:

"تورہ زادے یہ ساری مصیبت ہمارے اپنے اور ہمارے بزرگوں کے کفرانِ نعمت کے نتیجے میں ہم پر نازل ہوئی ہے۔ دیکھیے اللہ اب معاف کرتا ہے یا لمبی سزا دیتا ہے۔" پھر کہنے لگے: "آپ غیلان جائیں گے؟"

"مَیں وطنِ عزیز کے ایک ایک چپے پر جاؤں گا۔" مَیں نے جواب دیا۔

(۵)

اگلے روز صبح کے وقت مَیں رخصت ہوا۔ قلعے کے امیر نے دو سوار میرے ساتھ کر دیے تھے۔ ہم دن بھر چلتے رہے۔ رات ایک چشمے سے ہٹ کر پہاڑ کے دامن میں بسر کی اور پھر نمازِ فجر کے بعد دودھ اور سویق کا کھانا کھایا اور چل کھڑے ہوئے۔ اب ہم تختہ قراچہ کے بلند ترین پہاڑوں پر چڑھ رہے تھے۔ ان پہاڑوں کے پار سُرخ فوجیں متعین تھیں۔ ایک بار تو ہم ان کی چوکی کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ رہبر نے ہدایت کی آواز پیدا نہ ہونے پائے۔ ہو سکتا ہے دشمن کا کوئی دستہ قریب ہی گشت کر رہا ہو۔ شام کے وقت ایک سرسبز علاقے میں پہنچے۔ رہبر نے کہا: "اب دو گھنٹے کا سفر باقی ہے، کیا خیال ہے رات یہیں فروکش ہوں یا سفر جاری رکھیں؟" طے پایا کہ سفر جاری رکھنا چاہیے۔ چاندنی رات تھی، ہر چیز پر چاندی بکھری ہوئی تھی اور پورے علاقے کا حُسن دوبالا ہو رہا تھا۔ تقریباً دس بجے ہم منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ مہمان خانے میں اُترے۔ پوچھا: کھانا ہے؟ جواب اثبات میں ملا۔ خادم مکئی کی روٹی اور مٹی کی چائے دانی میں دودھ اور چینی کے بغیر چائے لایا۔ دعوتِ شیراز کا مزا آ گیا۔

مہمان خانے میں ہمارے علاوہ چالیس پچاس آدمی اور تھے۔ دستور تھا کہ جو شخص بھی مہمان خانے میں اُترتا، اپنا تعارف کراتا اور آنے کا مقصد بیان کرتا۔ ہم نے ایک چھوٹا سا رقعہ اندر بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک وجیہہ شیخ برآمد ہوئے۔ ہتھیاروں سے مسلح جیسے وہ میدانِ جنگ میں ہوں۔ ہر شخص سے فرداً فرداً ملے۔ سب سے فارغ ہو کر میرے پاس آئے۔ نام دریافت کیا، کچھ دیر تک خیر و عافیت دریافت کرتے رہے، پھر اندر کمرے میں لے گئے۔ یہ شیخ کا عبادت خانہ تھا، مگر رُوسی اسلحے سے بھرا ہوا۔ تھری ناٹ تھری کی رائفلیں، موزر پستول، بارود کے بکس، نیزے، تلواریں اور خنجر، غرض ہر چیز موجود تھی۔ ایک طرف چوبی تخت پر رنگی ہوئی کھال بچھی تھی جس پر ایک تکیہ اور ایک دبیز اُونی کمبل پڑا تھا۔ شیخ کی عُمر پچاس سے اُوپر تھی۔ بخارا کے فارغ شدہ جیّد عالمِ دین تھے۔ شیخ کے پاس اُس وقت کسی اسلامی مُلک کے کوئی بزرگ تشریف فرما تھے، ان سے میرا تعارف کرایا، فرمایا:

"یہ نوجوان، خوقندی حضرت کا خواہر زادہ ہے، اس کی سرگزشت بڑی سبق آموز ہے۔"

شیخ نے مجھ سے فرغانہ کے موجودہ حالات دریافت کیے۔ مَیں نے تین ماہ کے دوران میں سمرقند و بخارا، قرشی اور شہر سبز وغیرہ میں جو کچھ دیکھا تھا، سب بیان کر دیا۔ دونوں بزرگ چُپ چاپ اِس رُوداد کو سُنتے رہے، پھر شیخ نے فرمایا:

"ازماست کہ بر ماست۔ یہ سب کچھ ہمارے اپنے اعمال کی سزا ہے کہ ہم پر کفر و الحاد کی تاریک رات ۔۔۔ مصائب و آلام سے بھرپور رات مسلط ہو گئی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے اس کی سحر کب ہو گی، لیکن بہرحال ہمیں اپنے گناہوں اور کفرانِ نعمت کا کفارہ دینا ہے۔"

ان بزرگ شخصیت نے مایوسی ظاہر کی اور وطن سے ہجرت کر کے افغانستان یا کسی دوسرے مسلمان ملک میں چلے جانے اور آرام سے زندگی گزارنے کی رائے دی۔ شیخ نے فرمایا:

"سوال میرے یا چند مجاہدین کے آرام کا نہیں، مسلمانوں کے دین و ایمان کے تحفظ اور دفاع کا ہے۔ علما نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم مسلمانوں کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ مجاہدین کی شوریٰ نے ایران، افغانستان، عرب، ترکیہ، حتیٰ کہ ہندوستان کی مقتدر مسلمان جماعتوں سے مدد کی اپیل کی، مگر کہیں سے اسلامی اُخوت اور ہمدردی کا عملی مظاہرہ نہ ہوا۔ ہم نے اُن سے کہا کم از کم سوشلسٹ رُوس کے استبداد کے خلاف ہمارے جہاد اور مجاہدین کی قربانیوں ہی سے دُنیا کو آگاہ کیجیے، مگر یہ اپیل بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ لب فرمائیے، کونسا زندہ اور باغیرت مسلمان مُلک ایسا رہ گیا ہے جو ہمیں سہارا اور پناہ دے سکتا ہے۔ اس کے برعکس بعض ملکوں کی آزادی پسند تحریکیں اور ان کے روشن خیال رہنما، سُرخ استعمار کی تعریف میں رطب اللساں ہیں۔ ادھر حالت یہ ہے کہ جو بڑے بڑے لیڈر اور نمایاں افراد ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے ہیں، وہ حتیٰ کہ خود امیرِ بخارا بھی نظر بندی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اب ہمارے لیے کوئی پناہ ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات۔ اُس کے سوا نہ کوئی پناہ دے سکتا ہے اور نہ ہم کسی کی پناہ مانگتے ہیں۔"

یہ کہہ کر شیخ خاموش ہو گئے۔ مَیں نے دیکھا اُن بزرگ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کمرے میں عمیق حُزن و ملال پھیل گیا تھا جو لمحہ بہ لمحہ عمیق تر ہوتا جا رہا تھا۔

## ۴

اگلے روز جمعہ تھا۔ نمازِ جمعہ مَیں نے مجاہدین کے ساتھ پڑھی۔ تقریباً دو ہزار مجاہدین جمع تھے۔ مجاہدین کے شیخ ٹھیک وقت پر تشریف لائے، ہتھیاروں سے مسلح۔ انہیں دیکھ کر قرونِ اُولیٰ کے مسلمان سپہ سالاروں کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ پہلو میں دو نگان پستول اور خنجر لٹک رہا تھا، سینے پر گولیوں کی پیٹی آراستہ تھی اور ہاتھ میں تھری ناٹ تھری کی رائفل۔ عجز و انکسار کی تصویر بنے، ناپے تُلے قدموں سے چل کر منبر پر پہنچے، رائفل کا سہارا لے کر خطبہ دیا۔ خطبے میں جوش و جذبے کی گرمی بھی تھی اور فکر و ہدایت کی روشنی بھی۔ اللہ کی راہ میں جان نثار کر دینے کی ترغیب بھی تھی اور مایوسی کو دُور اور طمانیتِ قلب سے بہرہ ور کرنے کا سامان بھی۔ خطبے کے بعد نماز نے قلب و رُوح کے لُطف و سرُور کو دوچند کر دیا۔ دُنیا کی آلائشوں سے آلودہ رُوح کو جو تجربہ اُس روز ہوا، پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ فرض کے بعد سنتیں ادا کیں۔ سب لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ مَیں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، آخری دو صفوں میں مجاہدین ہاتھوں میں سنگینیں لیے چاق چوبند کھڑے تھے۔

مَیں نے شیخ المجاہدین سے درخواست کی: "مَیں چند گھنٹے مجاہدین کے مورچوں میں گزارنا چاہتا ہوں۔"

شیخ نے میری درخواست قبول کر لی، مجھے ایک رُومال عطا کیا اور ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا۔ مَیں جہاں بھی گیا، مجاہدین نے میرا خیر مقدم کیا۔ رُومال کو دیکھتے ہی سلامی دی۔ مسجد کی چھت پر چار جوان متعین تھے، وہ دُوربین سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے، اسی طرح ایک بلند و بالا پہاڑ پر مجاہدین نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ خبر رسانی کا انتظام نہایت عمدہ اور مؤثر تھا۔ اس مقصد کے لیے مختلف مراکز قائم تھے۔ تختہ قراچہ کے پہاڑ اور لنگرآتا دو اہم ترین مرکز تھے۔ (تختہ قراچہ، سمرقند اور شہر سبز کے درمیان بہت بڑا پہاڑ ہے، اسے عبور کرنے میں دو دن لگ جاتے ہیں، راستہ نہایت دشوار گزار ہے اور وہ بھی سال میں چند ماہ کے لیے کھلتا ہے) مجاہدین نے سولہ سولہ میل کے فاصلے پر چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ قاصد ایک چوکی سے دوسری چوکی تک پیغام پہنچاتا اور

وہاں سے نیا قاصد اگلی چوکی کے لیے روانہ ہو جاتا۔ اِس طرح سمرقند سے شام کی خبر صبح تک یہاں پہنچ جاتی بلکہ آٹا کے مرکز سے بخارا کی خبریں قزل ایچک کے چرواہا اور چوٹنے کا کام کرنے والے مجاہدین تک پہنچاتے۔ تقریباً پون گھنٹہ اسی طرح گھومنے پھرنے میں گزرا۔ مسجد پہنچا، تو دُعا ہو رہی تھی۔ اسی مجلس میں شیخ نے گزشتہ ہفتے کے حالات سنائے۔ پھر مجلسِ شوریٰ طلب کی اور اس کے سامنے رات والے بزرگ کی تجویز رکھی کہ ہمیں ہجرت کر جانا چاہیے۔ دیر تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ وطن ہی میں مقیم رہ کر آزادی کی جدوجہد جاری رکھی جائے۔

شام کا وقت تھا، سُورج غروب ہو رہا تھا! اچانک مجاہدین کے مرکز غیلان میں ایک پُرمسرت ہلچل سی مچ گئی۔ پتہ چلا شیخ المجاہدین کے ایک صاحبزادے عصام الدین جبر جو تقریباً تین ماہ سے لاپتہ تھے، آ گئے ہیں۔ عصام الدین ترکی اور فارسی کے نہایت بلیغ ادیب، شاعر اور علومِ اسلامی کے فاضل تھے۔ تاشقند میں جدید تعلیم بھی حاصل کی تھی، چنانچہ رُوسی بے تکلف بول اور لکھ سکتے تھے۔۔۔ انور پاشا مرحوم نے جن ترکستانی نوجوانوں سے اُمیدیں وابستہ کی تھیں، عصام الدین ان میں سے ایک تھے۔ سپہ گری کی تربیت انہیں انور پاشا نے دی تھی۔ عصام الدین بخارا کے قتلِ عام میں موجود تھے، پھر جب قرشی میں کمونسٹوں نے رُوح فرسا مظالم ڈھائے اور ایک حق گو عالمِ دین کو گولی سے اُڑا دیا، تو اس منظر کے عینی شاہدین میں بھی شامل تھے۔ بعدازاں جو ہنگامہ برپا ہوا اور سُرخ فوجوں کے ساتھ جنگ ہوئی، اس کی قیادت انہی نے کی۔ قرشی سے وہ بالیون گئے، وہاں کمونسٹوں نے انہیں گرفتار کر لیا، مگر اللہ نے مدد کی اور بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں سے افغانستان کی راہ لی، اب وہ افغانستان ہی سے آ رہے تھے۔ وہاں کی صورتِ حال کا انہوں نے مکمل اور گہرا جائزہ لیا تھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے، افغانستان کہاں تک مجاہدین کی مدد کر سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر کس حد تک مہاجرین کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے۔ جب وہ افغانستان میں داخل ہوئے، تو خاصے پُراُمید تھے، لیکن واپسی پر اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔

انہوں نے جو دیکھا اور محسوس کیا، پدرِ بزرگوار سے کہہ دیا۔ انہوں نے بتایا، افغانستان کی حکومت نے احکام جاری کر دیے ہیں کہ کسی شخص کو پناہ نہ دی جائے۔ مزار شریف کا گورنر رُوسیوں کے ساتھ گہرے روابط رکھتا ہے، وہ ان احکام کی تعمیل میں بہت زیادہ مستعد ہے۔ دریا پار کر کے جو شخص بھی پہنچتا ہے اُسے فوراً واپس کر دیتا ہے، چنانچہ اب تک کئی ہزار مہاجرین کو رُوسی فوج کے حوالے کر چکا ہے۔ بعض نمایاں افراد کو واپس کرتے وقت رُوسیوں سے بھاری معاوضہ بھی وصول کرتا ہے۔ عصام الدین نے ایک دردناک واقعہ بھی سنایا جس سے یہ لوگ اب تک بالکل بے خبر تھے! ابراہیم بیگ عرصہ دراز سے درواز کے پہاڑوں میں کمونسٹوں سے برسرِ پیکار تھا۔ سُرخ فوجوں نے آہستہ آہستہ اسے محصور کر لیا، گھیرا روز بروز تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ آخر ایک روز ابراہیم بیگ نے اپنے دو ڈھائی ہزار مجاہدین کے ساتھ محاصرہ توڑ کر دریائے آمو پار کیا اور افغانستان میں داخل ہو گیا، لیکن افغانستان نے انہیں پناہ نہ دی اور گرفتار کر کے رُوسیوں کے حوالے کر دیا! افغانستان میں بیس لاکھ سے زیادہ ترکمن اور ازبک اور تاجیک مہاجرین رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا پیشہ قراقلی بھیڑیں پالنا اور قالین بُننا وغیرہ ہے۔ ان کے لیڈروں کو یرغمال کے طور پر دارالحکومت کابل میں رکھا گیا ہے، ان سے ضمانت لی گئی ہے کہ وہ رُوس کے خلاف کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ عصام الدین نے ہندوستان کے سیاسی و دینی حالات بھی بیان کیے۔

دوسرے دن شیخ المجاہدین نے نمازِ عشا کے بعد مجاہدین کی شوریٰ طلب کی۔ مَیں بھی اس اجلاس میں شریک ہوا۔ ایسے مواقع پر معمول تھا کہ نمازِ عشا کی اذان دیر سے دی جاتی! اس طرح تمام لوگ جمع ہو جاتے۔ اس روز بھی ایک گھنٹہ دیر سے اذان دی گئی۔ مجمع غیر معمولی تھا۔ نماز کے بعد شیخ نے خطاب کیا۔ ان کے

ہاتھ میں رائفل تھی اور کمر میں تلوار۔ انبیاء کی دعوتِ حق کی تاریخ بیان کی، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حق و باطل کی جو کش مکش ہوئی، اس کا تذکرہ کیا، ترکستان کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا، مجاہدین کی مزاحمت کی داستان بیان کی، عصام الدین افغانستان سے جو خبریں لائے تھے ان کا خلاصہ بیان کیا اور کہا:

"اب آپ لوگ فرمائیں، کیا ارادہ ہے، حالات کے آگے سپر انداز ہونا چاہتے ہیں یا ہجرت اختیار کرنا۔ آپ اپنی مرضی سے جو فیصلہ بھی کریں گے اس پر عمل ہوگا۔"

رات کا وقت تھا، ہر طرف سکوت طاری تھا۔ شیخ خاموش ہوئے، تو سکوت اور بھی گہرا ہو گیا۔ چند لمحے اسی طرح خاموشی طاری رہی، پھر ایک نوجوان مجاہد کی آواز گونجی وہ کہہ رہا تھا:

"ہم جب ان پہاڑوں میں آئے تھے، تو خوب سوچ سمجھ کر آئے تھے۔ سالہا سال حالات کا جائزہ لینے کے بعد آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ہم اپنے عہد پر مرتے دم تک قائم رہیں گے، نہ تو دشمن کے ساتھ مصالحت کریں گے اور نہ ہجرت۔"

چند اور مجاہدین نے اس کی تائید کی۔ شیخ نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"آپ نے اپنے ساتھیوں کے خیالات سن لیے، کیا آپ کو ان کی رائے سے اتفاق ہے؟"

"اتفاق ہے" اتفاق" مسجد کا صحن گونج اٹھا۔

چراغ کی مدھم سی لو میں میں نے دیکھا شیخ کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک رہا تھا۔ گونج رات کی خاموشی میں ڈوب گئی۔ شیخ نے دوبارہ خطبہ مسنونہ دیا، پھر اذان، شش کلمات اور ایمانیات کا ورد کیا، آخر میں سب نے کلمہ طیبہ کو بلند آواز سے دُہرا کر اپنے عہد کی تجدید کی اور منتشر ہو گئے۔

ہم بھی اپنے پڑاؤ پر آ گئے۔ شیخ نے فرمایا: "تورہ زادے، اب اہلِ ایمان کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے ہیں۔ کفر و الحاد پر راضی ہو کر مقہور زندگی بسر کریں یا دینِ حق کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان دے دیں۔ تیسرا راستہ بھی ہے، ہجرت کا۔ استہ۔ مگر سوال یہ ہے ہجرت کر کے کہاں جائیں؟ افغانستان اور ہندوستان کے حالات تو تم سن ہی چکے ہو۔ اہلِ ایمان پر اللہ کی وسیع و کشادہ زمین کبھی اتنی تنگ نہ ہوئی تھی جتنی آج ہو چکی ہے۔" شیخ خاموش ہو گئے۔ یوں محسوس ہوا رات کی خاموشی اور گہری ہو گئی ہے۔

نمازِ تہجد کے بعد پہرے کی باری خود شیخ کی تھی۔ دو گھنٹے تک میں بھی ان کے ہمراہ رہا۔ شیخ مختلف باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا:

"مجاہدین کی تنظیم محض مردوں پر مشتمل نہیں ہے، ہماری عورتیں بھی اس میں شامل ہیں، انہیں باقاعدہ جنگی تربیت دی گئی ہے؛ چنانچہ دشمن جب حملہ کرتا ہے عورتیں ہمارے لیے بوجھ نہیں بنتیں۔"

(۳)

چوتھے دن میں شیخ سے رخصت ہوا۔ شیخ نے میرے ساتھ دس گھڑ سوار کر دیے۔ چھ دن تک ہم دشمن کے گشتی دستوں کی نگاہوں سے چھپتے چھپاتے سفر کرتے رہے۔ پہاڑی چوٹیوں سے پھلانگتے، دروں سے گزرتے اور جنگلوں کو طے کرتے ساتویں دن قاینار قشلاق کی حدود میں پہنچے۔ یہاں سے مشہور پہاڑ تاروز شروع ہوتا ہے جس کے دوسری طرف سمرقند ہے، شہر سبز بھی یہاں سے قریب پڑتا ہے۔ گھڑ سوار تو رخصت ہو گئے۔ میں نے بھیس بدل کر ایک خرکار (گدھے والے) سردار کی نوکری کر لی جو تقریباً ایک سو گدھے لے کر سمرقند جا رہا تھا۔ ایک دن پہاڑ پر چڑھنے اور ایک اترنے میں گزرا۔ سمرقند پہنچ کر ایک اوزبکستر (جنرل سٹور کے منیجر) سے تربوز کے بدلے کپڑا لینا چاہا، پرمٹ تو مل گیا، مگر اوزبکستر نے کہا:

"کپڑا کل آٹھ بجے ملے گا۔ آج شام افراسیاب میں ایک بہت اہم جلسہ ہے جس میں سب کی شرکت لازمی ہے۔"

خرکاروں کے سردار نے اپنے گدھوں کے باندھنے کا انتظام ایک کھلی حویلی میں کیا۔ میں نے اس سے رات بھر کے لیے رخصت

لی اور سیدھا میں قشلاق پہنچا۔ تین مہینوں میں یہاں کی دُنیا ہی بدل چکی تھی۔ حالات نہایت ابتر تھے۔ ظہر کی نماز میں صرف چند آدمی نظر آئے، وہ بھی خوفزدہ اور سہمے ہوئے۔ ایک صاحب سے دَبی زبان میں داملا بخاری کے متعلق دریافت کیا۔ پتہ چلا مہینہ بھر پہلے انہیں کمونسٹ پکڑ کر لے گئے تھے، کہاں؟ یہ پتہ نہیں چل سکا؛ البتہ چند روز بعد کمونسٹوں نے ڈونڈی پٹوائی تھی کہ داملا بخاری کو ان کی خواہش پر فرغانہ بھیج دیا گیا ہے، لیکن کسی کو اس اعلان پر یقین نہیں آیا۔ عام خیال یہی ہے کہ یا تو انہیں سائبیریا بھیج دیا گیا ہے یا موت کے گھاٹ اُتارا جا چکا ہے۔

میمن قشلاق سے میں شاہ زندہ پہنچا۔ یہاں کے قدیم کھنڈروں میں ایک قاری بچہ غفور جان (عبدالغفور) رہتا تھا۔ غفور جان میرا ہم وطن تھا، اندجان کا رہنے والا۔ نہایت خوش الحان قاری تھا، ساتوں قرأتیں جانتا تھا۔ جب قرآنِ کریم پڑھتا، تو سُننے والے وَجد میں آجاتے۔ تین مہینے پہلے جب میں آیا تھا، تو اسی نے مجھے پُرانے شہر سبز کی سیر کرائی تھی اور داملا بخاری سے ملوایا تھا۔ پتہ چلا کہ شاہ زندہ کے مزارات کو آثارِ قدیمہ کی حیثیت سے کمونسٹوں نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور اب ان مزاروں کے مجاور سوویٹ بیورو کے خاص الخاص آدمی مقرر کر دیے گئے تھے۔ غفور جان گزشتہ دو ماہ سے ایک مکان میں نظر بند ہیں اور یہی مجاور ان کی نگرانی کرتے ہیں۔

لوگ افراسیاب کی طرف رواں دواں تھے۔ اکثر کے چہروں سے صاف ظاہر تھا وہ مارے بندھے جا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ افراسیاب میں ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ سُرخ فوج، کمسومل اور کمونسٹ بھاری تعداد میں جمع تھے۔ لوگ برابر آ رہے تھے اور مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ نصف گھنٹے کے اندر اندر ان کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔

جلسے کا آغاز ایک کمونسٹ کی تقریر سے ہوا، تقریر کیا تھی طغرۂ امتیاز بن چکی تھی۔ پھر تین پتلے لائے گئے۔ ان میں ایک پتلا تقریباً عُریاں تھا، بس ایک لنگوٹی سی بندھی ہوئی تھی۔ جب اس پُتلے کو سٹیج پر لایا گیا، تو کمونسٹوں نے اس پر بے تحاشا پھُول برسائے، پھر اسے ایک بلند مقام پر رکھ دیا گیا۔ دوسرے دونوں پُتلوں کو آگ لگا دی گئی۔

اَب ایک مقرر اُٹھا اور مجمع سے رُوسی میں خطاب کیا۔ جن پُتلوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا، اُن کے متعلق اُس نے کہا:

"یہ دونوں ہندوستان میں انگریزی سامراج کے ایجنٹ ہیں، ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لیے برطانوی سامراج کا سیاسی بیورو اپنے ان گماشتوں سے کام لیتا ہے۔ یہ دونوں مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو انگریز کی جاسوس ہے۔ . . . انہیں علی برادران کہا جاتا ہے۔ . . . ."

پھر ننگ دھڑنگ پُتلے کا تعارف ان الفاظ میں کرایا:

"یہ ہندوستان کی شمعِ آزادی کا پروانہ ہے۔ ان کا دعویٰ ہے ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے اور وہ ہندو ہے۔ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا ان کا مقصدِ زندگی ہے۔ ان کو "مہاتما گاندی" کہا جاتا ہے۔ یہ برہنہ تن اس لیے رہتے ہیں کہ ان کی قوم غلام ہے، ان کا کہنا ہے جب تک میری قوم بھُوکی، ننگی اور انگریزوں کی غلام ہے میں بھی بھُوکا اور ننگا رہوں گا۔ یہ برطانوی سامراجیوں اور ان کے ایجنٹوں اور جاسوسوں کے جو مسلمان زمیندار، جاگیردار اور سرمایہ دار ہیں، سخت دشمن ہیں۔"

چونکہ لوگ کمونسٹوں کی دروغ گوئی اور خرافات کے عادی ہو چکے تھے، اس لیے انہوں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ جلسہ سامراجی ایجنٹوں کو کوسنے والے نعروں کی گونج میں ختم ہوا۔ (کوئی سوا سال بعد جب میں افغانستان سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا، تو شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا، انہیں یہ سارا واقعہ فارسی میں سنایا۔ علامہ اقبال نے مولانا ظفر علی خاں، سید حبیب مدیر "سیاست" اور ایک اور مولانا کو جن کا نام اس وقت بھُول رہا ہوں، بُلوایا اور مجھ سے

فرمایا، انہیں وہ قصہ پھر سناؤ۔)

افراسیاب سے میں اپنے ڈیرے پر پہنچا۔ خرکار سردار کو قاری غفور جان کی مظلومیت اور روا طلا نجاری کے غائب کر دیے جانے کا قصہ سنایا۔ سردار چپ چاپ میری باتیں سنتا رہا۔ دُو روز بعد ہم شہر سبز کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں خرکار سردار سے پوچھا "چچا میاں، یہ کمونسٹ اور سوشلسٹ کون لوگ ہیں اور کیا ہیں؟"

"ارے سوتمک بالا (بدھو لڑکے) تم فرغانہ کے رہنے والے ہو اور ان لوگوں کی اولاد ہو جنہوں نے تاریخ بنائی جنہیں انور پاشا نے بھی خراجِ تحسین ادا کیا اور جو دس سال سے اپنے دین و وطن کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ کون لوگ ہیں، کمونسٹ خدا کے منکر ہیں اور خدا پر یقین و ایمان رکھنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں اور سوشلسٹ وہ ہے جو زر، زمین اور زن میں سب لوگوں کو شریک کرنے کا علمبردار ہو، کچھ سمجھے؟" سردار نے جواب دیا۔

"مگر چچا میاں، آپ لوگ تو پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے ہیں، یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" میں نے ایک سوال اور کیا۔

سردار نے مجھے عجیب نظروں سے گھورا اور جواب دینے کے بجائے چپ سا ہو گیا۔ شاید میرے سوال نے اسے شک میں ڈال دیا تھا۔ وہ مجھے کمسوئل سمجھ رہا تھا۔ جی ہی جی میں اپنی حماقت پر سخت پریشان ہوا۔ اگر یہ خرکار مجھے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے ان پہاڑوں میں کسی پتھر کے نیچے دبا دے تو۔ . . . اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ سردار تو ایسا چپ ہوا کہ پھر اس نے کوئی بات ہی نہ کی۔ میں دل ہی دل میں سوچتا کیسا وقت آگیا ہے، ہر شخص دوسرے سے خوفزدہ ہے اور ایک دوسرے کو مشتبہ سمجھتا ہے۔ اب پہاڑی سفر طے ہو چکا تھا، سامنے چشمہ تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا، چشمے کے قریب پہنچ کر رک گئے، گدھوں کو پانی پلایا، مشکیزے بھرے، پھر وضو کیا اور نمازِ مغرب کے لیے کھڑے ہوئے۔ سردار نہایت خوش الحان تھا، قرأت جو کی، تو یوں محسوس ہوا جیسے زمین، آسمان، پہاڑ، سبزہ اور چشمے کا بہتا ہوا پانی سب وجد میں آگئے ہیں۔ نماز کے بعد کھانا کھایا۔ عشا کی نماز پڑھی اور قافلہ منزل کی طرف چل پڑا۔ دوسرے روز ہم شہر سبز کے مضافاتی علاقے میں پہنچ گئے۔ اب قافلے سے علیحدہ ہونے کا وقت آگیا تھا، چنانچہ میں نے رئیسِ قافلہ کو الوداع کہی اور سرآسیا کے راستے شہر سبز کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۴)

سرآسیا پہنچا، تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ پہلے اپنے نانا شیخ غیاث الدین ایشانؒ کے مزار پر پہنچا۔ شیخ کا مزار شہر سے باہر کچھ فاصلے پر تقریباً نصف ایکڑ رقبے میں پھیلے ہوئے احاطے کے اندر تھا۔ قبر کچی تھی، مغرب کی جانب تین اطراف سے کھلا، ستونوں پر قائم ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں بیک وقت ڈیڑھ دو ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ رات اسی جگہ تلاوتِ قرآن اور دعا و استغفار میں گزاری۔ سحر کے وقت روانہ ہوا اور نمازِ فجر شہر کی مسجد میں پڑھی۔

سرآسیا میں ماموں حضرت کے باغ تھے جن میں بیسیوں قسم کے انگوروں کی بیلیں، انار، انجیر، اخروٹ، بادام، آڑو اور سیب وغیرہ کے درخت تھے ایک باغ میں اس خیال سے فروکش ہو گیا کہ کوئی شناسا ملے، تو اس سے شہر کے حالات معلوم کر کے ماموں حضرت کی خدمت میں حاضری دوں۔ دوپہر کے وقت ماموں حضرت کا ایک خادم آیا۔ بڑے تپاک سے ملا، مگر کچھ بدحواس سا تھا۔

"خیر باشد؟" میں نے پوچھا۔ "پریشان نظر آتے ہو۔"

خادم نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، جیسے جائزہ لے رہا ہو کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ پھر کہنے لگا:

"سرخ فوج کے ایک دستے نے کل رات دو بجے سے خوقندی حضرت کے قلعے کا محاصرہ کر رکھا ہے اور خوقندی حضرت نظر بند کر دیے گئے ہیں۔ ۳، ۷ دن کے بعد یہ دوسری مرتبہ محاصرہ کیا

گیا ہے۔"

"عظام خاں (ماموں زاد بھائی) کیسے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"خیریت سے ہیں؟" اس نے جواب دیا۔

"انہیں میری آمد کی اطلاع دی جاسکتی ہے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"موقع مل سکا، تو ضرور اطلاع کر دُوں گا" خادم نے کہا اور رخصت ہوگیا۔

خادم عصر کے وقت رخصت ہوا تھا شام ہوئی، رات گوری، اگلا دن بھی گزر گیا، انتظار کی گھڑیاں طویل تر ہوتی چلی گئیں۔ خدا خدا کرکے رات کے ایک بجے عظام خاں آن پہنچے۔ ان کے ساتھ تمیر بیگ بھی تھے۔

دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اپنی "سیاحت" کی داستان مفصل بیان کی۔ عظام خاں نے بتایا:

"خوقندی حضرت سے کوئی شخص نہیں مل سکتا، بڑا سخت پہرہ بیٹھا ہوا ہے۔" پھر انہوں نے ایک دردناک واقعہ بیان کیا، آج بھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کہنے لگے:

"گزشتہ ہفتے خوقندی حضرت کی خدمت میں سمرقند سے ایک نہایت قابلِ اعتماد آدمی آیا، اس نے بتایا، جی، پی، او — (سوویٹ رُوس کی خفیہ پولیس) نے سٹالن کے حکم سے رُوس کے طول وعرض سے تاتاری، ترکستانی اور قفقازی علما کو بلوایا اور ایک محضرنامہ اُن کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں لکھا تھا: "ہم حاملانِ دین کا یہ ایمان ہے کہ آج سے قرنوں پہلے عرب میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے اور اپنی قوم کی اصلاح کی۔ اب اس بگڑی ہوئی دُنیا میں لینن آیا۔ اس نے ظلم سے نجات دلائی۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ مارکس اور لینن نے جو کچھ لکھا اور کہا اب وہی اسلام ہے اور مسلمانوں کے لیے قابلِ عمل ہے۔"

اُن سے کہا گیا وہ اس محضرنامے پر دستخط کردیں، لیکن ان مردانِ حق نے جی۔ پی۔ او کے حکم کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ کسی ایک نے بھی تو کمزوری نہ دکھائی۔ انہوں نے برملا کہا "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ مارکس اور لینن مادہ پرستی کے مارے ہوئے محض ایک عام انسان تھے، ان کی غیر فطری تعلیمات کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی فطری اسلامی تعلیمات سے کیا تعلق؟

عُلما کے اس جرأت مندانہ انکار پر کمونسٹ بھنا گئے۔ نہ صرف انہیں، بلکہ ان کے ہم خیال سینکڑوں عُلما کو راتوں رات گرفتار کرکے سائبیریا بھیج دیا۔ ۹۲ نمایاں حضرات کو ٹرکوں میں لاد کر مسلح فوج کی نگرانی میں "اوش" (ایک شہر) کے پہاڑوں میں پہنچا دیا۔ ہر شخص کو ایک ایک بوری چُونے کی اور ایک پھاوڑا دیا۔ پہلے ایک عالمِ دین کو حکم دیا کہ ایک فٹ چوڑا، دُو فٹ گہرا اور پانچ فٹ لمبا گڑھا کھودو۔ گڑھا تیار ہوگیا، تو حکم ہوا اس میں اُتر جاؤ، جونہی وہ گڑھے میں اُترا، اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی گئی، وہ زخمی ہوکر گر پڑا۔ اب دوسرے عالم کو، جس کے پاس چُونے سے بھری ہوئی بوری اور پھاوڑا تھا، حکم ہوا اس بوری کو گڑھے میں اُلٹ دو۔ حکم کی تعمیل کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ زخمی چلا رہا تھا، بوری پلٹی جاچکی، تو حکم ہوا گڑھے کو مٹی سے بھر دو۔ اس طرح اُسے زندہ ہی دفن کردیا گیا۔ اسی طرح ہر شخص نے اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھودی اور اسی انجام سے دوچار ہوا۔ یہاں تک کہ بانوے افراد ختم ہوگئے۔ آخری شخص کو زخمی کیے بغیر صحیح سالم زندہ دفن کردیا گیا۔ اس شخص کی ابھی زندگی باقی تھی، سُرخ پولیس اور فوج کے جانے کے بعد وہ گڑھے سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ چھپتے چھپاتے کاشغر پہنچا اور وہاں سے ہندوستان۔ ۱۹۳۵ء میں وہ دہلی میں مجھ سے ملا اور ٹھیک وہی داستان بیان کی جو سمرقند سے آنے والے شخص نے خوقندی حضرت سے بیان کی تھی۔

ان علما کو جو فوجی لائے تھے وہ سب کے سب رُوسی تھے یا ارمنی۔ داواش زادہ ایک ارمنی ان کا کمانڈر تھا۔ پہرے دستے میں

صرف ایک جوان تاتاری تھا۔ اس واقعے سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ موقع پا کر فوج سے بھاگ نکلا۔ اوش سے سمرقند پہنچا اور وہاں سے شہر سبز، خوقندی حضرت کو ساری داستان سُنا کر افغانستان کی طرف چلا گیا۔

تیمیر بیگ نے مزید حالات بتائے، اس نے کہا، "مہینے سوا مہینے سے شہر سبز، کتاب اور غذار پر مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ سینکڑوں افراد جن میں عُلما اور اعیانِ ملّت کی اکثریت تھی، غائب کر دیے گئے ہیں۔ شہر سبز اور گاؤں گاؤں میں خُفیہ پولیس کا زبردست جال بچھ چکا ہے۔ کل سے شہر سبز کے ریلوے اسٹیشن پر خُفیہ پولیس کے گماشتوں کا پہرہ بٹھا دیا گیا ہے۔"

"تورہ زادے، اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟" تیمیر بیگ نے دریافت کیا۔

"ایک بار تو شہر سبز دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

عظام خاں اور تیمیر بیگ کچھ دیر صلاح مشورہ کرتے رہے۔ آخر طے پایا، میں باغبان کے بھیس میں شہر سبز جاؤں گا۔ مجھے تین گدھے دے دیے گئے، ان پر انگوروں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لادیں اور شہر سبز کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ مجھ سے کچھ بڑا ایک باغبان لڑکا بھی کر دیا گیا۔ انگوروں کی یہ ٹوکریاں مجھے شہر کے بارہ دروازوں میں سے چار دروازوں کے قریب دُکانداروں کو دینا تھیں، اس طرح شہر سبز کا ایک بڑا حصّہ دیکھنے کا موقع مل گیا۔ پُورا شہر فوج کی گرفت میں نظر آتا تھا۔ جگہ جگہ فوجی گشت کرتے دکھائی دیتے تھے، سب کے سب رُوسی تھے۔

قرشی دروازے کی طرف گدھوں کو ہانکے لیے جاتا تھا کہ ایک ازبکتور (جنرل سٹور والے) نے میرا نام لے کر آواز دی۔ میں نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ اس نے پھر پکارا، "میرے خوقندی تورہ!"

"یہ کون شخص ہے؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ چلتے چلتے رُکا، پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ازبکتور بھی دُکان سے نکل کر سڑک پر آ گیا تھا، فوراً پہچان لیا۔ قرشی کے اسٹیشن سے جن تین قزاق متورین کے ساتھ (رُوسی جیب کتروں سے بچنے کے لیے) ریستوران پہنچا تھا، یہ شخص ان میں سے ایک تھا۔ گرمجوشی سے ملا، کہنے لگا:

"گدھوں کو چھوڑ کر میرے پاس ضرور آنا۔"

میں نے ہامی بھر لی۔

چار بجے کے قریب پہنچا، تو ازبکتور میرا انتظار کر رہا تھا۔ پتہ چلا وہ اِس سٹور کا انچارج بھی ہے اور آڈیٹر بھی۔ دوسرے کارکن یہودی تھے۔ اس نے گزشتہ تین چار ماہ کے حالات بتائے قرشی کے بعد وہ تینوں کہاں کہاں گئے اور پھر وہ شہر سبز کیسے آ گیا۔ کہنے لگا:

"اب کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"کرکی دیکھنے کا خیال ہے۔"

"اور وہاں سے افغانستان چلے جاؤ گے؟"

"ہاں، اگر بالکل ہی مجبور کر دیا گیا، تو ——"

"اِس وقت کہاں جاؤ گے؟"

"تیمیر بیگ کے پاس یا ماموں حضرت کے قلعے میں۔"

"نہیں نہیں، قلعے مت جانا، ہاں تیمیر بیگ کا چوبارا خالی ہو تو وہاں ٹھہرنا، ورنہ سرآسیا چلے جانا۔ قلعے کی طرف رُخ بھی کیا تو دھر لیے جاؤ گے اور ہاں گدھے وغیرہ کہاں ہیں؟"

"میرے ساتھ مالی کا آدمی آیا تھا، وہ لے گیا۔"

"بہت اچھا کیا۔"

گودام کا سامان بے ترتیب چاروں طرف بکھرا پڑا تھا۔ ازبکتور کہنے لگا:

"آؤ ذرا یہ سامان ٹھکانے سے رکھ دیں، تھوڑی بہت مزدوری بھی دلوا دوں گا۔"

کوئی آدھ گھنٹے میں سامان اپنی جگہ پر لگا دیا۔ ازبکتور نے مجھے پانچ روبل کا بل دے دیا جو میں نے گودام کے یہودی منشی سے وصول کر لیا۔ بل دیتے وقت ازبکتور نے کہا: "کل بھی آنا، کوئی کام نکل ہی آئے گا۔" روبل وصول کرتے وقت میں نے دستخط لاطینی رسم الخط میں کیے، یہودی خزانچی بڑے غور سے میرے دستخطوں کا جائزہ

لیتا رہا۔

شام کے قریب مدرسہ مالک اژدھر پہنچا۔ وہ ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ طالب علم اور مدرسین وغیرہ سب چُپ چاپ تھے، چہرے غم والم میں مُتتے ہوئے۔ پتہ چلا مدرسے کے دو ممتاز عالمِ دین اور فاضل اساتذہ کو تقریباً بیس دن ہوئے جی۔پی۔او کے آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ آج تک پتہ نہیں چل سکا وہ کہاں ہیں اور زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

اسی غم والم کی فضا میں نمازِ مغرب ادا کی۔ نماز میں صرف چند آدمی شریک ہوئے، اکثر نے اپنے حجروں میں پڑھی۔ رات سایہ گستر ہو چکی تھی۔ میں سخت پریشان تھا کہاں جاؤں۔ مدرسے اور مسجد میں تو کسی اجنبی کو ٹھہرانے کی سخت ممانعت تھی۔ ابھی حیران پریشان سوچ ہی رہا تھا کہ تیمیر بیگ آتے نظر آئے۔ باغبانوں کے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ میرے پاس سے چُپ چاپ گزر گئے، مزار پر پہنچے، دعائے مغفرت مانگی اور پانی پی کر اسی طرح خاموشی سے چلے گئے، میری طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں سمجھ گیا صورتِ حال سنگین ہے اور وہ مجھے لینے آئے ہیں؛ چنانچہ میں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس طرح کہ کسی کو شبہ تک نہ ہو کہ میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔ ان کی دُکان تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ وہ تو دُکان کے اندر چلے گئے، میں آگے نکل گیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد پیچھے مُڑ کر دیکھا، تو دو آدمی باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار کم کر دی تاکہ وہ دونوں آگے نکل جائیں۔ تقریباً دو سو قدم کے فاصلے پر دونوں ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ میں تیزی سے واپس ہوا اور تیمیر بیگ کی دُکان پر پہنچا۔ وہ چوبارے میں سے جھانک رہے تھے۔ فوراً نیچے آئے اور دروازہ کھولا اور اوپر لے گئے۔ دن بھر کی رُوداد سُنی۔ پتہ چلا اس ازبکتور کا نام تنگری قُل ہے۔ پوچھا: "انہوں نے کوئی نئی بات بتائی؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"نئی بات یہ ہے کہ خوقندی حضرت کو سائبیریا بھیجا جا رہا تھا، مگر سارے شہر نے احتجاج کیا۔ شہر کے چار کمونسٹ سرغنوں کے نام خطوط کا تانتا بندھ گیا: اگر خوقندی حضرت کو ضرر پہنچانے کی جسارت کی گئی، تو ہم ان کے ایک ایک جوڑ کا بدلہ کمونسٹوں سے لیں گے؛ چنانچہ شہری سوویٹ کا اجلاس منعقد ہوا اور اس صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی:

خوقندی حضرت بے شک رُوحانی ہیں، لیکن وہ عوامی آدمی ہیں، ان کی زندگی عوام کی خدمت میں گزری ہے؛ لہٰذا انہیں اُن کے حال پر چھوڑا جاتا ہے۔

یہ قرارداد پورے شہر میں ڈونڈی پٹوا کر نشر کی گئی، اس طرح عوام میں پھیلے ہوئے اضطراب کو رفع کیا گیا، مگر یہ پسپائی محض عارضی ہے۔ شہر میں خُفیہ پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ حضرت کے قلعے کے چاروں طرف سفید پوش پولیس نگرانی کر رہی ہے۔ رات کو مزید سُرخ فوج بھی پہنچ گئی اور ایک دستہ قلعے کے اندر متعین کر دیا گیا ہے۔"

رات کے گیارہ بجے تنگری قُل آیا، کہنے لگا: "تم نے مزدوری وصول کرتے وقت لاطینی میں دستخط کیوں کیے تھے؟ آئندہ ایسا مت کرنا۔"

پتہ چلا جب میں پانچ روبل وصول کر کے چلا آیا، تو یہودی خزانچی نے تنگری قُل سے کہا: "یہ لڑکا کہاں کا رہنے والا ہے؟ یہاں کا تو نظر نہیں آتا، یہاں کس کے پاس آیا ہے؟"

کوئی آدھی رات تک ملک کی صُورتِ حال پر گفتگو ہوتی رہی۔ سوشلسٹ استبداد کی گرفت روز بروز سخت ہوتی جا رہی تھی۔ قرشی، غذار، کتاب، سمرآیا اور شہر سبز ہر جگہ لوگ راتوں رات غائب ہو رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کمونسٹ اس علاقے میں مسلمانوں کی دینی و اجتماعی زندگی پر آخری بھرپور وار کرنے والے ہیں۔ پھر میرا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ مجھے افغانستان چلے جانا چاہیے۔ بالآخر فیصلہ ہوا میں افغانستان چلا جاؤں، وہاں حالات نارمل ہیں۔ افغانستان میں پناہ مل جائے تو ٹھیک، ورنہ ہندوستان کی راہ لوں۔

---

# ۵

آخر رختِ سفر باندھا اور کرخی کے راستے افغانستان کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ماموں حضرت سے آخری بار ملنے کی حسرت دِل ہی دِل میں رہ گئی۔ تیمیر بیگ نے والدہ مکرمہ کا عطا کردہ سامان میرے حوالے کیا۔ اسٹیشن پر پہنچا اور ترمیز جانے والی ریل گاڑی میں جوں توں کر کے اللہ کا نام لے کر سوار ہو گیا۔ کرخی جنکشن سے ایک اسٹیشن اِدھر "امام جعفر" نامی ایک مقام ہے۔ بالکل ویران اور جنگل، چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک مزار ہے، چنانچہ اسی کے نام سے یہ مقام منسوب ہے۔ گاڑی یہاں پہنچی، تو رُک گئی۔ خُدا ہی جانتا ہے اتفاقاً یا معمول کے مطابق، میرے کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے بہت سے لوگ اُتر گئے۔ آخر میں دو چاق چوبند فرغانوی نوجوان بھی اپنا مختصر سا سامان لے کر اُترے۔ اُنہیں دیکھ کر میں بھی اُتر گیا۔ سب لوگ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چل دیے۔

دو تین منٹ تک میں حیران پریشان کھڑا چاروں طرف دیکھتا رہا۔ ریل گاڑی نظر سے اوجھل ہو چکی تھی۔ گاڑی سے اُترنے والے لوگ لائن کے ساتھ ساتھ قطار میں چلے جا رہے تھے۔ سب سے پیچھے وہ دونوں فرغانوی نوجوان تھے۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کس مقام پر کھڑا ہوں اور یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ (بعد میں پتہ چلا کہ اس جگہ کا نام امام جعفر تھا)
آخر بلا ارادہ ان فرغانوی نوجوانوں کے پیچھے ہو لیا۔ دوسرے لوگ بڑی تیزی سے چل رہے تھے اور جلد ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ہم آدھ گھنٹہ چلتے رہے اور تقریباً بارہ بجے دریائے آمو کے کنارے پہنچ گئے۔ راستے میں نہ تو ان نوجوانوں نے کوئی بات کی نہ میں نے۔ دریا کے کنارے پہنچ کر انہوں نے ہاتھ منہ دھوئے اور بیٹھ گئے۔ میں بھی کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ صبح سے کچھ کھایا نہ تھا۔ سفر سے بھوک اور چمک اٹھی تھی۔ میں نے اپنے توردا (تھیلے) سے شہر سبز کا خصوصی تحفہ کوماچ (گرم راکھ میں دبا کر پکایا ہوا موٹا سا نان)، اور انگور کے چند گچھے نکالے۔ اپنا سامان وہیں چھوڑ کر اُن کے پاس پہنچا، سلام کیا، نان اور انگور اُن کے سامنے رکھ دیے اور ازبک رسم کے مطابق دُعا دی:

"یول بولسون ہارمنگ لر؟" (آپ کا سفر بخیر و خوبی طے ہوا اور تکان نہ ہو۔)

انہوں نے بھی جواب میں سلام اور دعائیہ کلمات کہے، کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ اب ہم بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی اپنے توشہ دان سے تالقان نکال کر دسترخوان پر رکھ دیا۔ (تالقان کو ترکستان کا ستو کہنا چاہیے۔ میدہ چاول کو بھون کر اور مصری یا قند ملا کر پیس لیا جاتا ہے۔ بوقت ضرورت ایک چٹانک پھانک لیتے ہیں اور اوپر سے پانی یا سبز چائے پی لیتے ہیں۔ لڑائی کے دنوں میں بالعموم اسی پر بسر ہوا کرتی تھی۔)

"کیا آپ بھی امام صاحب کے مزار پر جائیں گے؟" ایک نوجوان نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"قاری مسعود سے ملیں گے؟"

"کون سے قاری مسعود؟" میں نے سوال کیا۔

"پائیتوق والے قاری مسعود۔" نوجوان نے کہا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ تقریباً دو برس پہلے پاسپورٹ کے لیے مجھے اندجان جانا پڑا تھا اور پائیتوق میں ان کے ہاں مہمان ہوا تھا۔ میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

کھا پی کر امام جعفر کے مزار کی طرف روانہ ہوئے۔ دریا کے کنارے اس نام کا گاؤں آباد تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک حسین و جمیل مسجد کی طرف بڑھے۔ مسجد لبِ دریا سنگ خارا کی ایک چٹان پر بنی ہوئی تھی اور پانی میں خاصی دور تک چلی گئی تھی۔ مسجد کا نظارہ نہایت دلکش تھا۔ دریائے آمو تبریز کی طرف سے آتا ہے، اس کی اٹھتی بیٹھتی ہوئی موجیں مسجد کے قدموں سے سر پٹک پٹک کر گزر جاتی ہیں۔ مسجد سے ملحق امام جعفر کا مزار تھا۔ میں مسجد کے چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سامنے صحن میں قاری مسعود ٹہل رہے تھے۔ پیچھے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا، تو وہ غائب تھے۔

ظہر کی نماز میں تقریباً آٹھ نو آدمی شریک ہوئے۔ امام مسجد قاری مسعود ہی تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر حلقۂ درس بنا کر بیٹھ گئے۔ یہ ترکستان میں عام رواج تھا، نماز کے بعد لوگ بیٹھ جاتے۔ ایک شخص قرآن کریم کی چند آیات پڑھتا اور امام صاحب ان کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرتے۔ امام صاحب نے مجھ سے تلاوت کی فرمائش کی۔ بے اختیار میری زبان پر سورۂ دہر جاری ہو گئی۔ پوری سورۃ میں نے قرأت اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھی۔ ایک عجیب سی کیفیت دلوں پر طاری ہو گئی۔ اہلِ مجلس دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میری اپنی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ حلقۂ درس تقریباً ایک گھنٹے تک رہا، پھر لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے اور امام صاحب حجرے میں۔ میں اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ اچانک مجھے اپنے اس استخارے کا خیال آگیا جو میں نے بخارا کی مسجدِ مغاک میں کیا اور ایک عجیب و غریب خواب دیکھا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ترمیز کا ٹکٹ لے کر ریل گاڑی میں سوار ہو گیا ہوں۔ گاڑی ایک ویران سے مقام پر رکتی ہے، لوگ کہتے ہیں اس جگہ کا نام امام جعفر ہے، کچھ لوگ گاڑی سے اتر جاتے ہیں۔ میں ایک شخص سے پوچھتا ہوں: کیا مجھے بھی یہیں اترنا ہے؟ "نہیں، تمہارا اسٹیشن تو ابھی بہت دور ہے، وہاں رات کے وقت پہنچو گے۔" وہ جواب دیتا ہے۔ اتنے میں دو نوجوان جو وضع قطع سے فرغانوی معلوم ہوتے ہیں، گاڑی سے اتر جاتے ہیں، میں بھی ان کے پیچھے ہو لیتا ہوں، لیکن وہ مجھ سے کچھ پیچھے رہتے ہیں، پھر ایک مزار سے ملحق مسجد میں داخل ہوتا ہوں، تھوڑی دیر بعد ظہر کی نماز ہوتی ہے اور لوگ حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (سورۂ دہر) کی تلاوت کرتا ہوں، پیش امام زار زار رونے لگتے ہیں، پھر میں حدود افغانستان کی طرف جا نکلتا ہوں، بارہ تیرہ افغانی مجھے پکڑ لیتے ہیں، میرے بارے میں ان کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے؛ تاہم وہ سب میرے ساتھ شفقت سے

پیش آتے ہیں، کھانا کھلاتے اور تسلی دیتے ہیں اور میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میرے دل میں کوئی فکر و اندیشہ باقی نہیں رہا —— پھر آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس خواب کا پہلا حصہ حقیقت بن کر میرے سامنے آچکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر میرا ایمان پختہ تر ہو گیا کہ جب تم کسی کام کا ارادہ کرو، تو پہلے استخارہ کر لیا کرو۔ ایک عجیب سا جوشِ ایمانی رگ و پے میں دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ بے ساختہ ترکی زبان میں بلند آواز سے پکار اٹھا:

"اے اللہ، میں تیری ہستی پر ایمان رکھتا ہوں، تیری ذات ہر جگہ موجود ہے، تو حافظ ہے، قادر ہے، رزّاق ہے، سمیع و بصیر ہے، موت بھی تیرے ہاتھ میں ہے اور زندگی بھی، کمونسٹ جاہل، غافل اور ظالم ہیں، میں تیری ہی مقتدر ذات پر تکیہ کرتا ہوں اور تجھی سے مدد مانگتا ہوں۔"

میری اس حمد و ثنا سے متاثر ہو کر قاری مسعود حجرے سے نکل آئے اور بولے:

"مسافر بالہ (مسافر لڑکے) تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"کرخی!" میں نے جواب دیا۔

"پرمٹ ہے؟"

"وہ کیا شے ہے؟"

"پرمٹ اجازت نامے کو کہتے ہیں جو ملٹری سوویٹ کا کمانڈر جاری کرتا ہے۔"

"تو پھر آپ انتظام کر دیں۔"

"پول داری؟ (پیسہ ہے؟)"

میں نے پانچ پانچ روبل کے پانچ نوٹ نکال کر پیش کر دیے۔ قاری مسعود بہت خوش ہوئے، پوچھا:

"کچھ اپنے لیے بھی رکھا ہے؟"

"خدا کا دیا بہت کچھ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ میں نے قرشی میں کچھ کپڑا خریدا تھا جسے تیمور بیگ نے شہر سبز میں خاصے منافع پر بیچ دیا تھا اور رقم روانگی کے وقت میرے حوالے کر دی تھی، اس میں سے آدھی رقم میں نے نکالی اور قاری مسعود کی خدمت میں پیش کی، "یہ رقم آپ اپنی ضروریات پر صرف کیجیے۔" میں نے کہا۔ "کیا خبر مجھ سے یونہی ضائع ہو جائے۔"

قاری کو ایک خوشگوار حیرت نے آلیا۔ کہنے لگے: "اے دیوانہ بالا، کرخی میں تمہیں پیسے کی بہت ضرورت پڑے گی، اس علاقے کے لوگ نہ تو منگانیوں کی طرح فیاض ہیں، نہ رحم دل۔" پھر انہوں نے پوچھا:

"کیا تم اعظم خاں منگانی ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ پھر قاری نے اپنا تعارف کرایا۔

میں مسکرایا اور بولا: "میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ دو فرغانوی نوجوانوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ یہاں امام جعفر میں رہتے ہیں۔"

قاری بھی جواب میں مسکرا دیے، پھر وہ ماضی کی خاکستر میں دبی ہوئی یادوں کی چنگاریاں کریدنے لگے۔ ثابت خاں تورہ و املا کے انتقال پر فرغانہ اور ترکستان کے بڑے بڑے علما منگان آئے تھے اور ہمارے باغیچے میں ٹھہرے تھے۔ قاری مسعود بھی اس موقع پر آئے تھے اور اس محفل میں شریک ہوئے۔ دیر تک اس محفل کی باتیں سناتے اور ہچکیاں لے کر روتے رہے۔ پھر موضوعِ سخن بدلا، کہنے لگے:

"میں یہاں تقریباً ڈیڑھ سال سے مقیم ہوں، تم نے ظہر کے وقت جو قرأت کی، اس پر میرے دل پر بڑی ہی رقت طاری ہوئی اور جب تم نے دوسرا رکوع شروع کرتے وقت بڑے پُر درد لہجے میں فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا کی تکرار کی، تو میری نگاہ میں ترکستان کے ان بے بدل فرزندوں، مقدس بزرگوں اور مایۂ ناز متبحر علما کی صورتیں گھوم گئیں، جنہوں نے اس ارشادِ خداوندی پر عمل کر دکھایا۔ روسیوں نے انہیں خریدنے کے لیے ہر طرح کے لالچ

دیے، لیکن ناکام رہے، پھر اُن پر ظلم کے کوڑے برسائے اور انہیں بڑی وحشت اور درندگی سے شہید کر دیا، مگر اُن کے پائے ثبات کو متزلزل نہ کر سکے۔ تورہ زادے، ان ظالموں نے قاضی عبدالمجید خاں حضرت کو رات کے وقت گھر سے نکالا اور جنگل میں لے جا کر ان پر چاندماری کی اِس طرح "مشق" کی کہ مرنے نہ پائیں ـــ جب وہ زخموں سے چُور ہو کر نیم جاں ہو گئے، تو ان کے زخموں پر چُونا مَلا اور پھر گڑھے میں پھینک کر اُوپر سے گرم گرم راکھ ڈالی اور کہا:

"اَب بھی ہمارا کہا مان لو، ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

اس مَردِ حق نے جواب میں سورۂ دہر کی یہی آیت پڑھی اور نیم جاں حالت میں چُونے میں مدفون ہو گئے۔ محی الدّین حضرت کو لے جا کر کہا گیا، اگر تم لینن کو محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا (نعوذ باللہ) ہمسر تسلیم کر لو اور اپنے عوام کو اس کی تلقین کرو، تو تمہیں، تمہاری اولاد، تمہارے احباب اور اعزّہ سب کو قانون سے بالا قرار دے دیا جائے گا۔ اُن سے خواہ کیسا ہی جرم سرزد کیوں نہ ہو، کبھی کوئی گرفت نہ ہوگی۔ حضرت مخدوم (اللہ ان کے مرقد کو نُور سے بھر دے) نے بڑے تحمّل سے فرمایا:

"چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک۔ لینن تو اُس خاک کے برابر بھی نہیں جس پر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم بول و براز فرمایا کرتے تھے۔ وہ ظالم، بدکردار، مادّہ پرست، مادّے سے ماورا حقیقتوں کا مُنکر اور اِن حقائق پر ایمان رکھنے والے ہر شخص کو حقِ زیست دینے سے انکاری ہے خواہ اس کا علم و عقل اور صلاحیتیں اپنی مثال آپ کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم انسانیّت کے محسن اور انسانِ کامل ہیں۔ مادّے سے ماورا حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اُنکی طرف دعوت دینے والی ہستی، ظلم و ستم کے چُنگل میں گرفتار نوعِ انساں کے آزادی دہندہ۔"

اس جواب پر کمونسٹ بھنّا گئے۔ انہیں ایک بلند مقام پر کھڑا کر دیا گیا۔ فائرنگ سکواڈ کے پانچ گروپ بنا دیے گئے۔ ایک گروہ نے سَر کا نشانہ باندھا، دوسرے نے شانوں کا، تیسرے نے سینے کا، چوتھے نے رانوں کا اور پانچویں نے گھٹنوں کا اور پھر ایک ساتھ فائر کھول دیا۔ چشم زدن میں آپ کا جسمِ مبارک ٹُکڑے ٹُکڑے ہو گیا۔ خُون اور گوشت کے لوتھڑوں کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی۔ اِس سفّاکانہ حرکت کی خبر کو چُھپانے کی کوشش کی گئی، لیکن ایک ہفتے کے اندر اندر بچّہ بچّہ اس سے واقف ہو چکا تھا۔ حضرت مخدوم کی ثابت قدمی اور بے باکی نے دینِ اسلام کی حقّانیت اور عظمت کا نقش دِلوں پر اور گہرا کر دیا۔ جب تم نے سورۂ دہر کی یہ آیت بار بار پڑھی، تو حضرت مخدوم اور دوسرے بزرگوں کی تمہارے باغیچے میں چہل قدمی، مجلسیں اور مذاکرات اور پھر ان کی شہادت کے منظر نگاہوں میں پھر گئے۔"

قاری صاحب نے لمبی سرد سانس لی اور قدرے توقّف کے بعد کہا: "تورہ زادے، یہاں کیسے آنا ہوا اور کہاں کا ارادہ ہے؟"

"امام کرخیؒ کے مزار کی زیارت کرنے آیا ہوں، کرخی میں آپ کی جان پہچان کے لوگ تو ہوں گے، مجھے ان سے متعارف کروا دیجیے۔" مَیں نے جواب دیا۔

"ہاں، میرے دو تین شناسا وہاں رہتے ہیں۔" قاری نے کہا اور ان تینوں کے گھر کا راستہ خُوب اچھّی طرح سمجھا دیا، پھر کہنے لگے:

"یہاں سے ہر روز چار بجے ایک لانچ دوسرے کنارے پر جاتی ہے۔ دریا پر پاسپورٹ اور پرمٹ پُوچھیں گے، تو کہہ دینا مسعود قاری کا بھائی اور طالب علم ہوں، بڑی قبر دیکھنے جا رہا ہوں، ہم طالبعلموں میں بحث چھڑ گئی ہے کہ قبر سات گزی ہے۔ مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر جانے دیا، تو خیر، ورنہ گت بُری بنے گی، بس سوچ لو۔"

مَیں نے دعاؤں کی کتاب "دلائل الخیرات" اور والدہ ماجدہ کا عطا کردہ قرانِ کریم باندھ کر کندھے پر ڈال لیا۔ باقی تمام اشیا جن میں ایک قیمتی جیبی گھڑی، ایک ٹائم پیس اور دو ہزار روبل سے زائد نقد رقم تھی، تورُبے (تھیلے) سمیت قاری کو دے دی اور کہا:

"یہ چیزیں رکھ لیجیے۔ اگر رُوسی فوجیوں کے ہاتھوں بچ نکلا اور دریا پار پہنچ گیا، تو آپ نے جن لوگوں کا پتہ دیا ہے انہی کی معرفت اطلاع دے دوں گا، مناسب سمجھیں، تو یہ چیزیں بھیج دیجیے گا۔ لیکن اگر پکڑا گیا، تو میں آپ کے ساتھ کسی قسم کے تعلق سے صاف انکار کر دوں گا، آپ بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر دیجیے گا۔"

قاری نے میری چیزیں رکھ لیں۔ میں سلام کر کے چل کھڑا ہوا۔ ابھی مسجد کے دروازے ہی پر تھا کہ قاری مسعود پہنچ گئے، روتے ہوئے میرے پاؤں پکڑ لیے، کہنے لگے:

"سید زادے، میں بڑا بدبخت ہوں، تمہیں گواہ بنا کر توبہ کرتا ہوں، تم بھی دُعا کرو اللہ مجھے معاف فرمائے، میں بڑا گنہگار ہوں۔۔"

روتے روتے قاری کی گھگھی بندھ گئی۔ میں حیران کھڑا سوچ رہا تھا خدایا یہ کیا ماجرا ہے؟ قاری صاحب تھے کہ تکرار کیے جا رہے تھے۔۔۔۔ میں توبہ کرتا ہوں۔۔۔۔۔ میں بڑا گنہگار ہوں۔۔۔۔۔ آخر میں نے انہیں تسلی دی کہ اللہ بخشنہار ہے، غفور الرحیم ہے، وہ آپ کی توبہ قبول کرے گا، پھر سلام کیا اور مسجد سے نکل آیا۔

بعد میں پتہ چلا قاری مسعود کا مطلب کیا تھا، وہ کمونسٹوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور اپنی چمڑی بچانے کے لیے خفیہ پولیس میں شامل ہو چکا تھا۔

( ۲ )

گھاٹ زیادہ دُور نہ تھا، لانچ تیار کھڑی تھی میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ دریا کے پار ترکمانستان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے جس کی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں۔ کرخی ترکمانستان کا بڑا قدیم شہر ہے۔ مشہور محدث اور فقیہ حضرت امام معروف کرخیؒ کا مدفن اور انہیں کے نام سے منسوب ہے۔ خاصا بڑا شہر ہے۔

لانچ نے ابھی آدھا سفر ہی طے کیا تھا کہ ایک مسلح فوجی نے پرمٹ اور (غیر ملکیوں سے) پاسپورٹ دیکھنے شروع کیے۔ آخر میں میرے پاس آیا اور پاسپورٹ طلب کیا۔

"میں مُلکی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا، تو پرمٹ دکھاؤ۔" فوجی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"میں کتہ گور (امام کرخیؒ کے مزار) کی زیارت کرنے جا رہا ہوں، واپس آ جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

فوجی مشتعل ہو گیا اور ظالم نے پورے زور سے ایک تھپڑ مُنہ پر دے مارا۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے، دُنیا گھومتی ہوئی نظر آئی اور میں دھڑام سے دریا میں جا گرا۔ خوش قسمتی سے مجھے تیرنا آتا ہے اور سانس روک کر پانی کے اندر دیر تک رہ سکتا ہوں۔ میں نے فوراً سانس روکا اور ایک لمبا غوطہ مارا معاً سطح آب پر تڑ تڑ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ فوجی نے پستول سے پے در پے کئی فائر کیے، لیکن میں جنوب کی طرف خاصی دُور نکل گیا تھا۔ بیس پچیس منٹ تک تو پورے ہوش و حواس سے پانی کے اندر ہی اندر بہتا چلا گیا، سانس پھولنے لگتی، تو سطح آب پر آ جاتا۔ ایک بار مُڑ کر دیکھا، لانچ خاصی دُور رہ گئی تھی اور دوسرے کنارے پر پہنچا چاہتی تھی۔ دریا کا پانی ٹھنڈا ایخ تھا۔ دیر تک پانی میں رہنے سے جسم سُن ہوا جاتا تھا، طاقت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار میرے ہوش و حواس جواب دے گئے۔

ہوش آیا، تو دریا کے کنارے سرکنڈوں میں پھنسا ہوا پایا۔ — قرآن مجید اور دلائل الخیرات پٹکے میں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھ پاؤں میں ذرا بھی سکت نہ رہی تھی، خاصی دیر تک یونہی پڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ سرکنڈے پکڑ کر رینگتا ہوا باہر نکلا، ہاتھ پاؤں چھل گئے۔ غروب آفتاب کے قریب خشکی پر پہنچا۔ اُٹھنے کی کوشش کی، تو ٹانگیں جواب دے گئیں۔ آخر لیٹے ہی لیٹے دیر تک ہاتھ پاؤں ہلاتا، گھسٹتا ہوا ایک کھلی جگہ پہنچا۔ ہاتھ پاؤں ہلانے سے دوران خون تیز ہوا، جسم میں گرمی پیدا ہوئی اور پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ دوبارہ زندگی اور قوت ملنے پر بے اختیار سجدے میں گر پڑا۔ دیر تک اپنے آقا و مولا کا شکر ادا کرتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد سر اٹھایا، تو پوری قوت عود کر آئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی

حادثہ مجھ پر نہیں گزرا۔

چاندنی رات تھی، دُور دُور تک سنسان جنگل پھیلا ہوا تھا۔ کرخی شاید کئی میل دُور شمال میں رہ گیا تھا۔ دریا کے کنارے دُور تک سرکنڈے سر اُٹھائے کھڑے تھے، ہوا چلنے لگی تھی، جسم پر گیلے کپڑے تھے، کپکپی سی طاری ہو گئی، ہوا سے بچنے کے لیے سرکنڈوں میں پناہ لی، ایک کھلی جگہ سرکنڈوں کے پتّوں کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا، گویا قدرت نے میرے لیے بستر بچھا رکھا تھا، اس پر رات بھر خُوب مزے سے سوتا رہا، علی الصبح آنکھ کھلی، اذان کہی اور نماز پڑھی۔ سُورج طلوع ہوا، تو سرکنڈوں سے باہر نکلا اور دریا کا نظارہ کرتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ کوئی دو فرلانگ فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک گھنا جنگل آگیا۔ اندر داخل ہوا، تو قدرتِ خداوندی نظر آئی، جنگلی درختوں میں شہتوت کے درخت بھی تھے جن پر سفید، لال، پیلے اور سیاہ پکے ہوئے توت لدے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا زبان پر جاری ہو گئی۔ اپنے اللہ کی رزّاقی اور شانِ کریمی پر ایمان اور مضبوط ہو گیا۔ شکم سیر ہو کر کھائے، پیٹ بھر کر جنگل سے نکلا، دُور شہر نظر آ رہا تھا، اُس طرف چل کھڑا ہوا۔ زوالِ آفتاب سے کچھ پہلے شہر کے مضافات میں پہنچ گیا۔ تھک کر چُور ہو گیا تھا، ایک درخت کے سایے میں سستانے کے لیے لیٹا، تو نیند نے آ لیا۔

کافی دیر تک سوتا رہا، اچانک شور غل سے آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں، پانچ قوی ہیکل آدمی کھڑے زور زور سے باتیں کر رہے ہیں، ہیبت ناک چہرے، بڑی بڑی مونچھوں سے اور بھی خوفناک ہو گئے تھے، قد کاٹھ اور وضع قطع سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ تُرک نہیں ہیں، یہ لوگ میرے بارے ہی میں باتیں کر رہے تھے، آخر طے کیا کہ اِس لڑکے کو ڈیرے پر لے جائیں، میری طرف متوجہ ہوئے، ایک شخص نے فارسی میں تابڑ توڑ سوال کر دیے:

"تو کیستی؟ از کجا آمدی؟ چہ ارادہ داری؟"

(تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں کا ارادہ ہے؟)

مَیں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا، مَیں تیری بات نہیں سمجھتا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ڈیرے پر لے گئے۔ یہ ایک بہت بڑی سرائے تھی۔ ہم ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوئے، وہاں ایسے ہی سات خوفناک انسانی دیو اور موجود تھے۔ ہال کے ایک کونے میں مُرغ کا شوربا پک رہا تھا، خوشبو سارے ہال میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے مجھے چارپائی پر بٹھایا اور خود باتیں کرنے لگے۔ باتیں میرے ہی متعلق تھیں، جو لوگ مجھے لائے تھے، انھوں نے رپورٹ پیش کی، ساتوں آدمی اس دوران میں مجھے گھُور گھُور کر دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد کھانا آ گیا، سب نے بیٹھ کر کھایا اور مجھے بھی اپنے ساتھ شریک کیا۔ کھانا کھا چکے، تو پھر میرے متعلق بحث چھڑ گئی۔ ایک شخص نے میرے کندھے پر بندھی ہوئی پوٹلی کھولی، دو کتابیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"یہ کیا ہیں؟" ایک ترجمان کے ذریعے مجھ سے پوچھا گیا۔

"دلائل الخیرات اور قرآن شریف ہے۔" مَیں نے جواب دیا۔

"یہ گیلی کیوں ہیں؟" ایک سوال اور ہوا۔

"مَیں دریا میں گر پڑا تھا، بڑی مشکل سے بچا۔" مَیں نے کہا۔

"اچھا، پہلے قرآن مجید دھوپ میں خشک کر لو، پھر بات کریں گے۔" ایک شخص نے جو دُوسروں سے زیادہ شفیق اور نرم دل تھا، مجھ سے کہا۔

مَیں سرائے کے ایک کونے میں، جہاں دھوپ آ رہی تھی، جا بیٹھا اور قرآن مجید کے اوراق کھول کھول کر سکھانے لگا۔ ان لوگوں کا شور اور بلند ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہی شفیق اور نرم دل شخص میرے پاس آیا اور فارسی میں اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"لڑکے، تم جا سکتے ہو، مگر جلدی کرو جلدی، یہاں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرو، بس بھاگ جاؤ، قسمت اچھی تھی کہ بچ گئے۔" پھر ہاتھوں کو نچاتے اور انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے فارسی میں کہا۔

"جہاں تم سو رہے تھے وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر کنتہ گور والی جامع ہے، وہاں ڈیرا ڈال دو۔"

مَیں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور سرائے سے نکل کر جنگل کی طرف روانہ ہوگیا۔

بعد ازاں جب کرخی میں ڈھائی ماہ ٹھہرنے کا موقع مِلا، تو پتہ چلا یہ لوگ افغان تھے اور مزار شریف کے گورنر کے آدمی تھے۔ سوویٹ رُوس کے خفیہ محکمے کے عملے میں شامل تھے افغانستان کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو پکڑنا ان کا کام تھا قاری مسعود جنہوں نے میرے سامنے توبہ کی تھی اسی محکمے سے منسلک تھے۔ اللہ تعالےٰ نے ان جاسوسوں کے دل میں رحم ڈال دیا اور مَیں بچ نکلا، ورنہ نہ جانے کتنے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر سوویٹ حکومت کے حوالے کر چکے تھے۔

**( ۳ )**

غروبِ آفتاب کے وقت مَیں "کتہ گور" کے احاطے میں پہنچ گیا میرے سامنے ایک قلعہ نما مسجد کھڑی تھی، اندر داخل ہوا صحن وسیع، کشادہ دالان، بڑے بڑے حجرے، مدرسہ اور خانقاہ۔ غرض یہ مسجد تُرکستان کی مسجدوں کی خصوصیات کا مکمل مرقع تھی۔ مشرقی سمت میں ایک بہت بڑی قبر تھی۔ یہی مشہور محدث امام معروف کرخیؒ کا مزار تھا۔ اتنے میں اذان کی آواز بلند ہوئی۔ مؤذن ایک حد سے زیادہ سیاہ فام شخص تھا۔ ایسا سیاہ فام آدمی مَیں نے پورے تُرکستان میں نہیں دیکھا۔ اُسی نے نماز پڑھائی۔ مقتدی صرف دو تھے۔ ایک مَیں خود اور دوسرا ایک اور آدمی۔ یہ دوسرا شخص سُنتیں پڑھے بغیر چلا گیا۔ امام نے بھی سُنتیں پڑھیں اور نکل کھڑا ہوا مَیں نے سنت اور نوافل ادا کیے، اُٹھا اور مزار کی طرف بڑھا۔ امام دروازے پر میرا منتظر کھڑا تھا۔ مجھے مزار کی طرف جاتے دیکھ کر ترکمانی لہجے میں آواز دی:

"راستہ اِدھر ہے۔" اور پھر مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا ابھی مَیں دروازے سے پُوری طرح نکلا بھی نہ تھا کہ امام نے دروازہ بند کر دیا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔

رات سایہ فگن ہو چکی تھی مشرقی افق سے اُمڈتی ہوئی تاریکی پُوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ کچھ دیر تک تو مَیں سخت پریشانی کے عالم میں کھڑا سوچتا رہا۔ یہ پہاڑ سی کالی سیاہ رات کہاں بسر کروں گا؟ پھر بے سوچے سمجھے مسجد کا چکر لگایا مسجد کی دیوار نہایت ضخیم اور بلند و بالا تھی۔ مشرق کی جانب کوئی بیس پچیس ایکڑ زمین جُتی ہوئی تیار پڑی تھی، کچھ فاصلے پر ایک بڑا سا کنواں تھا، کنویں کے قریب ہی توُت کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کی بلند و بالا مضبوط اور گھنی شاخیں تقریباً سوا سو مربع فٹ کے رقبے میں پھیلی ہوئی تھیں، یہ زمین اور مزار سے متصل دو باغ، در اصل امام کرخیؒ کے مزار اور مسجد کے لیے وقف تھے اور اب ایک زراعتی فارم (کولخوز) کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ مَیں درخت پر چڑھا، اس کی گھنی مضبوط شاخوں پر ایک مچان سا بنایا، کنویں پر اُونٹ کی پُشت پر ڈالنے والی پُرانی زین اور گدے وغیرہ پڑے ہوئے تھے، اُن سے بستر کا کام لیا، عشا کی نماز پڑھی اور سو گیا۔ سحری سے کچھ پہلے آنکھ کھُلی، درخت سے نیچے اُترا مویشیوں کے لیے جو حوض تھا، اُس سے وُضو کیا، دوگانہ پڑھا، پھر دیر تک اپنے ربّ سے باتیں کرتا اور دیر تک دُعائیں مانگتا رہا۔ اس دوران میں آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ جاگا، تو نماز فجر کا وقت ہو چکا تھا مسجد گیا، لیکن دروازہ بند تھا۔ دستک پر دستک دی، مگر صدائے برنخاست۔ آخر دروازے ہی پر نماز پڑھی۔ یہ سوچ کر کہ ہم ترکستانی مسلمانوں پر کتنی بڑی مصیبت آن پڑی ہے اور دین و ایمان کی کیسی بھاری آزمائش میں مُبتلا ہو گئے ہیں، دیر تک روتا اور دین و ایمان کی سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا، پھر بادیدۂ پُرنم اُٹھا اور جنگل کی راہ لی۔ ایک بلند سے ٹیلے پر چڑھ کر قرآن کی تلاوت کی اور دیر تک اوراد و وظائف کرتا رہا۔ پھر پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے جنگل میں گھُس گیا اور تُوت سیر ہو کر کھائے۔ اگلے کئی روز تک میرا یہی معمول رہا۔ رات اس مچان پر گزارتا اور پیٹ کا دوزخ تُوت سے بھرتا۔

اب کافی سورج چڑھ آیا تھا، تُوت کے جنگل سے نکلا، تو اس جُتی ہوئی زمین میں چند ترکمن کیاریاں بنا رہے تھے۔ ان کے پاس

پہنچا۔ "السلام علیکم" بے اختیار میری زبان سے نکل گیا اور ترکی دستور کے مطابق دُعا دی۔ "بار منگ لر" (آپ کی محنت بار آور ہو)

انہوں نے بھی بڑے جوش سے جواب دیا۔ غالباً یہ لوگ نئے نئے کاشت کار بنے تھے۔ اُن کے کام سے نہ تو مہارت ظاہر ہوتی تھی نہ نفاست۔

"آپ ان کیاریوں میں کیا بوئیں گے؟"

"ٹماٹر۔" انہوں نے کہا۔

"ٹماٹر؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ کیاریاں تو اس کے لیے موزوں نہ ہوں گی۔ پانی پوری طرح گردش نہیں کرے گا اور خشک مٹی گارا بن جائے گی، گارے کے خشک ہونے ہوتے موسم گزر جائے گا اور ساری محنت اکارت جائے گی۔"

دونوں کسان بے حد خوش ہوئے، کہنے لگے: "اے بالا، تنگری بار لاقا لیسن۔" (اے لڑکے، تجھے خدا اپنی برکت سے نوازے تمہیں بتاؤ ٹماٹر کے لیے کیاریاں کس طرح بناتے ہیں۔ . . ."

فرغانہ میں سبزی کی کاشت نہ صرف دیہات میں عام ہے، بلکہ شہر کے لوگ بھی اپنے گھر کے باغیچوں میں ٹماٹر، مولی، شلجم، گاجر اور پیاز وغیرہ بوتے ہیں، چنانچہ مجھے بھی اس کام میں مہارت تھی۔ میں نے آٹھ دن تک ان لوگوں کا ہاتھ بٹایا۔ کام مکمل ہو گیا، تو انہوں نے نہ صرف طے شدہ رقم دلوائی بلکہ خوش ہو کر مزید چالیس روبل اپنی کمیٹی سے منظور کروا کر دیے۔ ایک روز بارہ ایک بجے کے قریب میں کام میں مصروف تھا کہ ایک سُرخ و سفید شخص اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سوار ہمارے فارم پر آیا۔ فارم کے ہیڈ نے بڑی تعظیم کے ساتھ سلیوٹ کیا۔ ہاتھ میں چھڑی لیے اُس نے کھیتوں کا معائنہ کیا۔ اچانک ایک جگہ اُس نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا، پاؤں میں موچ آگئی، چنانچہ کسان اُسے اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ اس طرح یہ بلا ٹل گئی۔ یہ شخص کمیونسٹ پارٹی کا رکن اور سروے انسپکٹر تھا، مذہباً یہودی تھا۔ اگر وہ میرے پاس آتا، تو ضرور پوچھ گچھ کرتا اور کوئی نہ کوئی فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا — خدائے عظیم نے اِس طرح مجھے اُس سے چھٹکارا دلایا۔

(۴)

چند روز کے اندر اندر میں اِن ترکمن کسانوں میں گھل مِل گیا۔ انہی کا سا لباس اور طور و اطوار اختیار کر لیے۔ ان لوگوں کے گھروں میں بے روک ٹوک آنے جانے لگا۔ میں نہ صرف کھیتی باڑی میں اُن کا ہاتھ بٹاتا، بلکہ شہر (کرخی) میں اُن کے جو کام ہوتے تھے وہ بھی کر کے لاتا۔ اس طرح کرخی میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ قاری مسعود نے جن تین آدمیوں کے پتے دیے تھے، اُن سے مِلا، ان کے ذریعے میری امانت بھی پہنچ گئی۔ اب خزاں کا موسم شروع ہو گیا تھا، درختوں کے پتے جھڑنے لگے تھے، تُوت کے درخت میں بنا ہوا میرا نشیمن غیر محفوظ ہو چلا تھا۔ جہود (فارم کا یہودی منیجر۔ ترکستانی یہود کو جہود بولتے ہیں) سے اپنی مزدوری وصول کر چکا تھا۔ اس میں سے خاصی رقم میں نے کنویں والے کسانوں کو دے دی، وہ لوگ میرے اور زیادہ ممنون ہو گئے۔ ان کے خلوص اور محبّت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے امام کرخیؒ کے مزار کے گرد پھیلے ہوئے حجروں میں سے ایک حجرہ میرے لیے مخصوص کروا دیا۔ ایک سرٹیفکیٹ بھی لے کر دیا جس میں لکھا تھا:

"یہ شخص ماہرِ نباتات اور اوزبکستر کے ٹماٹروں کا نگران ہے۔"

یہ سرٹیفکیٹ میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس کی مدد سے میں شہر میں آزادی سے گھومنے پھرنے لگا۔ دوپہر کا وقت بالعموم شہر ہی میں کاٹتا۔

ایک روز میں نے شہر سے آٹھ ترکمن نان خریدے (ترکمن نان بڑے بڑے ہوتے ہیں اور ایک نان پونے دو سیر سے زیادہ وزنی ہوتا ہے) اور سر پر اٹھا کر امام کرخی (مزار) کی طرف چل دیا۔ یونہی بلا ارادہ بڑی اور سیدھی سڑک چھوڑ کر دوسری سڑک پر ہو لیا۔ شہر سے کافی دُور پہنچ کر احساس ہوا کہ میں ایک خطرناک راستے پر آ نکلا ہوں، ہر چند منٹ کے بعد فوجی ٹرک زَن سے میرے پاس سے نکل جاتے۔ خیال آیا کہ واپس ہو جاؤں

مگر کوئی نامعلوم قوت جیسے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اب میں شہر سے بہت دُور نکل آیا تھا۔ سڑک کے بائیں جانب قدرے ہٹ کر ایک قلعہ دکھائی دیا۔ جگہ جگہ فوجی جوان پہرہ دے رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا یہ گورنر ہاؤس تھا۔ میں فوجیوں کی نظر سے بچنے کے لیے سڑک کے دائیں جانب پھیلے ہوئے کھلے میدان میں ہو لیا۔ کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ چلا ہوں گا کہ دُور سامنے سے گرد و غبار اُٹھتا نظر آیا۔ کوئی قافلہ چلا آرہا تھا۔ قافلہ قریب پہنچا تو میں دَم بخود ہو کر رہ گیا، یہ قافلہ تجارتی نہیں قیدی لڑکیوں کا تھا۔ کوئی ایک ہزار سے زائد نوجوان لڑکیاں۔ ان کی عمریں بارہ برس سے پچیس برس تک ہوں گی، سب کی سب نازک اندام۔ اُن کے چہرے گرد وغبار سے اَٹے ہوئے تھے۔ کپڑے اکثر کے پھٹ چکے تھے، چہرے مہرے اور کپڑوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا سب شریف اور کھاتے پیتے گھرانوں کی چشم و چراغ ہیں۔ ہر لڑکی کے ہاتھ میں ایک پھاوڑا تھا اور پاؤں میں چاروق (کچی کھال سے بنے ہوئے جوتے جو عموماً گڈریے پہنتے ہیں) تھے۔ تقریباً پچاس فوجی انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے لیے چلے آرہے تھے۔

ان لڑکیوں کے پہلے گروہ نے مجھے دیکھا، تو آگے بڑھ کر گھیر لیا۔ میرے سر پر نان دیکھ کر ازبکی لہجے میں پوچھا: "آکا، تم نان بائی ہو؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "البتہ اگر تمہیں ضرورت ہے، تو لے سکتی ہو۔"

میں نے نانوں کے کوئی پچاس ٹکڑے کر کے لڑکیوں میں تقسیم کر دیے، یہ لڑکیاں سب کی سب بخارا، سمرقند، تاشقند، خوقند، اندجان، نمنگان، خوجند، کاگارہ اور قرشی وغیرہ کی رہنے والی تھیں، میرے پوچھنے پر رو پڑیں، کہنے لگیں:

"ہم دینی عالموں، زمینداروں، تاجروں، قومی لیڈروں اور دوسرے شرفا کی ناموس اور دل کے ٹکڑے ہیں۔ اپنے والدین اور شوہروں کے ساتھ ہمیں بھی شہری حقوق سے محروم کر کے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ ہم میں سے اکثر کے ماں باپ یا تو قتل کر ڈالے گئے ہیں یا کسی اور جگہ بھیج دیے گئے ہیں۔ یہاں ہم سے دن میں چھ گھنٹے اور رات کے وقت چار گھنٹے مختلف کام لیے جاتے ہیں۔"

"اِس وقت آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"کھیتوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ابھی وہ پورا جواب نہ دے پائی تھیں کہ اُن کے نگران فوجی آن پہنچے۔ ایک نے بڑے درشت لہجے میں رُوسی زبان میں پوچھا:

"تم کون ہو؟" اُس کے تیور بُری طرح بگڑے ہوئے تھے۔

میں نے دِل ہی دِل میں کہا آج خیر نہیں۔ ابھی میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکیاں بول اُٹھیں:

"یہ شخص نانبائی ہے، ہم اس کے نان لے کر کھا گئے ہیں، اب یہ پیسے مانگ رہا ہے۔"

ان مظلوم لڑکیوں کی داستانِ غم سُن کر اور انہیں اس بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں کمونسٹ درندوں کے نرغے میں دیکھ کر سخت صدمہ ہوا اور دِل بھر آیا۔ یکایک دوسرا فوجی چنگھاڑا:

"کیا یہ ٹھیک کہتی ہیں؟"

اُس کی چنگھاڑ پر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ فوجی سمجھا غریب نانبائی ہے، اپنی روٹیوں کی وجہ سے روتا ہے۔ اُس نے میری طرف ہمدردانہ نظر سے دیکھا۔ اتنے میں باقی لڑکیاں بھی پہنچ گئیں۔ آخر ان لڑکیوں کے نگرانِ اعلیٰ نے مجھے روٹیوں کی قیمت وصول کرنے کے لیے ایک چٹھی لکھ کر دی اور کہا:

"کل یہاں آکر اپنی رقم وصول کر لینا۔"

میں یہ ذکر کرنا بھول گیا کہ جس مقام پر ان لڑکیوں سے اتفاقاً ملاقات ہوئی، وہ ایک جیل خانہ تھا۔ جیل خانے میں داخل ہوتے وقت ان کی حاضری لی گئی۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے

کام لیا۔ ہر لڑکی اپنا اور باپ کا نام بلند آواز سے پکارتی اور اندر چلی جاتی۔ مقصد یہ تھا کہ میں اُن کے آتے پتے سے واقف ہو سکوں، لیکن میں صرف چند نام ہی سُن سکا۔ ایک نے کہا:

"باطوربائی قزمی خدیجہ من اندجان لیک" (میں باطوربائی کی لڑکی خدیجہ اندجان کی رہنے والی ہوں)۔

دوسری نے کہا:

"اندجان لیک توردی داملا قزمن تورسون ای" (میں اندجان کے توردی داملا کی بیٹی تورسون ہوں)۔

تیسری بولی:

"نمنگان لیک اسمٰعیل جان قاری داملا قزمنی زبیدہ دید ورلار" (مجھے نمنگان والے اسمٰعیل جان داملا کی لڑکی زبیدہ کہتے ہیں)۔

چوتھی نے اپنا نام تفصیل سے پکارنا چاہا، تو نگران افسر غرایا:

"صرف نام بتاؤ" پھر میری طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور پھٹ پڑا: "یہاں کیوں کھڑے ہو؟ چلے جاؤ، ورنہ۔۔۔"

اور میں بوجھل دل لیے وہاں سے چلا آیا۔

(۵)

اِس خیال سے کہیں یہ علاقہ ممنوع نہ ہو اور جاسُوسی کے الزام میں نہ دھر لیا جاؤں، میں آگے جانے کے بجائے واپس شہر کی طرف چل پڑا۔ ملت کی بیٹیوں کو اس حال میں دیکھ کر دل خُون کے آنسو رو رہا تھا۔ اُن کی آوازیں اب تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں، ان کی غم آلود بے بس نگاہیں جیسے میرے دل میں پیوست ہو گئی تھیں اور کہہ رہی تھیں: ترکستان کے غیرت مند مسلمانو، تمہاری غیرت کو کیا ہوا؟ تمہاری بیٹیاں اغیار کے چنگل میں گرفتار ماری ماری پھر رہی ہیں۔۔۔۔۔

جوشِ غیرت سے میرا سینہ کھول اُٹھا، لیکن فوراً ہی بے بسی نے آ لیا اور میں ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ شہر کے قریب پہنچ کر میں نے راستہ بدل دیا۔ ریت کے ایک ٹیلے پر چڑھ کر شہر کی طرف دیکھا۔ مغرب کی جانب جنگل سے متصل ایک مسجد نظر آئی، اسی طرف ہو لیا۔ مسجد میں پہنچا، تو ظہر کا آخری وقت ہو چلا تھا۔ یہ ایک کاروان سرائے کی مسجد تھی جو اسلامی دور میں تعمیر ہوئی تھی۔ افغانستان سے آنے جانے والے قافلے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ مسجد کے نمازی بالعموم افغان ہی ہوتے تھے۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ نماز میں بھی دھیان انہی مظلوم لڑکیوں کی طرف رہا۔ ان کی صورتیں آنکھوں کے آگے پھرتی رہیں۔ سلام پھیر کر دیر تک قبلہ رُخ بیٹھا روتا رہا۔ اسی عالم میں اونگھ آ گئی اور گر پڑا۔ ایک شخص جو مسجد کے کونے میں بیٹھا تھا، میرے پاس آیا اور پوچھا:

"افغانستان جاؤ گے؟"

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا: "ہاں"۔ لیکن پھر خوف اور پچھتاوے کی لہر تن بدن میں دوڑ گئی۔ کہیں یہ کونسٹوں کا گماشتہ (ایجنٹ) تو نہیں؟ غالباً اُس نے میری رگ رگ میں دوڑتا ہوا خوف چہرے سے بھانپ لیا، مجھے تسلی دی اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

عصر کی نماز پڑھ کر ہم مسجد سے نکلے، چلتے چلتے شام ہو گئی۔ غروبِ آفتاب کے قریب ایک مکان میں داخل ہوئے، دراصل یہ بھی ایک سرائے تھی۔ افغانوں کی ایک جماعت اندر مقیم تھی۔ میرے رہبر نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ ایک افغان طالب علم تھا، گزشتہ کئی سال سے وہ بیسیوں ترکستانیوں کو افغانستان پہنچا چکا تھا، کہنے لگا:

"اللہ رب العزت نے چاہا تمہیں بھی دارالاسلام لے چلوں گا، میرے ساتھ تمہارے دو ہم وطن اور بھی ہیں۔ کل رات اللہ کا نام لے کر ہم روانہ ہو جائیں گے۔ کل مغرب سے پہلے یہاں پہنچ جانا۔"

(۶)

اگلے روز میں علی الصبح اپنا سامان لے کر سرائے مسجد پہنچ گیا۔ شام کے وقت میرا رہبر افغانی طالب علم بھی آ گیا۔ اس کے ساتھ دو فرغانوی نوجوان تھے۔ انہوں نے پانی کے چھوٹے چھوٹے

مشکیزے پُشت پر لٹکا رکھے تھے۔ پاؤں میں چاروق تھے اور سر پر افغانی صافے۔ دو ایک گھنٹے تیاری میں گزرے، سرائے مسافروں سے بھر گئی تھی، سب کے سب افغان تھے۔ لباس وغیرہ سے ہم ترکمن نظر آتے تھے۔ افغانستان میں چونکہ ترکمن بھی رہتے ہیں اس لیے کسی کو بھی ہم پر شک نہیں گزرا۔ اس کے باوجود میں دِل ہی دِل میں سخت پریشان رہا۔ نمازِ مغرب کے بعد ہم ایک ایک کر کے مسجد سے نکلے۔ تقریباً دس بجے تک شہر سے بہت دُور نکل آئے۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا، تو شہر مدھم چاندنی میں لپٹا ہوا ایک بڑا سا سیاہ نقطہ نظر آتا تھا۔ سامنے لق و دق میدان حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ میدان میں قدم رکھتے ہی ہمارے رہبر نے ہدایات دیں۔ ہم چاروں الگ الگ سفر کریں گے۔ ہر ایک کے درمیان دو سَو گز کا فاصلہ رہے گا، یہ نہایت ضروری ہے تاکہ کمونسٹوں کے گماشتوں کا سامنا ہو جائے، تو سبھی نہ پکڑے جائیں۔ کاروان کی بڑی سڑک ہمارے دائیں ہاتھ رہے گی۔ ہم سڑک سے ذرا ہٹ کر چلیں گے؛ تاہم سڑک نظر میں رکھیں گے، ورنہ آگے چل کر جو ریگستان شروع ہو رہا ہے اس میں بھٹک جانے کا خطرہ ہے۔ ہم نے اپنے راہبر کی ہدایات پر عمل کیا۔ بڑی سڑک چھوڑ دی اور قدرے ہٹ کر سڑک کے بائیں جانب چلنے لگے۔ سب سے آگے ہمارا رہبر تھا، پھر دو دو اور تین تین سَو قدم کے فاصلے پر ہم تینوں تھے۔ چلتے چلتے ایک نہر کے کنارے پہنچے۔ دو سَو قدم کے فاصلے پر لکڑی کا ایک پُل تھا۔ تقریباً ایک سَو فٹ چوڑا۔ کارواں روڈ اسی پُل پر سے گزرتی تھی۔

ہمارے رہبر نے ہمیں مشورے کے لیے بُلانے، خطرات وغیرہ سے آگاہ کرنے اور ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنے کے لیے کچھ آوازیں مقرر کر دی تھیں۔ بُلانے کے لیے ایک جنگلی جانور کی آواز مقرر تھی۔ نہر کے قریب پہنچتے ہی اُس نے مقررہ آواز بلند کی۔ ہم فوراً تیز تیز قدم اُٹھا کر اُس کے ساتھ جا ملے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ پُل کے دونوں طرف دو مسلح سنتری سو رہے تھے جس کنارے پر ہم تھے، اُس طرف سنتری کے ساتھ ایک کُتا بھی تھا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی سو رہا تھا۔ طے پایا کہ دو آدمی کُتے اور سنتری پر پہرہ دیں گے اور دو پُل پار کر کے دوسرے سنتری کے سَر پر کھڑے ہو جائیں گے۔ اس دوران میں اگر کوئی واقعہ رُونما نہ ہوا، تو باقی دونوں ساتھی بھی پُل عبور کر لیں گے، لیکن اگر خدانخواستہ کُتا یا سنتری جاگ اُٹھے، تو تیزی کے ساتھ دونوں سنتریوں کے ہتھیاروں پر قبضہ کر کے انہیں ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تین ساتھی تو بخیریت گزر گئے، چوتھے نے بھی پُل پار کر لیا، لیکن جونہی وہ سوئے ہوئے سنتری کے پاس سے گزر کر گھنی جھاڑیوں کے قریب پہنچا، اُس نے ٹھوکر کھائی اور دھڑام کر گر پڑا۔ رات کے سنّاٹے میں دھم کی آواز آئی۔ کُتا بھونکنے لگا اور سنتری جاگ اُٹھے۔ ایک نے دوسرے کو آواز دی:

"کیا بات ہے؟"

ہم فوراً قدِ آدم گھنی جھاڑیوں میں چھُپ گئے اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ دونوں سنتری بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے، کُتا خاموش ہو چکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھی چُپ ہو گئے۔ جنگل میں خوفناک سناٹا پھر چھا گیا۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے چلتے رہنے کے بعد رہبر نے آواز کا پھر اشارہ دیا۔ ہم اُس کے پاس لپک کر پہنچے۔ پتہ چلا کہ رہبر راستے کی صحیح سمت بھُول گیا ہے۔ رات بھر راستے کی تلاش میں چلتے رہے۔ صبح نمودار ہوئی، تو ایک ٹیلا نظر آیا، اُس کے دامن میں پہنچ کر رُک گئے۔ نمازِ فجر ادا کی اور ایک جھاڑی کے سائے میں ریت کھود کر لیٹ گئے۔ سارا دن وہیں پڑے رہے۔ کرخی سے روانگی کے بعد ایک کھیل بھی اُڑ کر مُنہ میں نہیں گئی تھی، صرف تھوڑا تھوڑا پانی پیا تھا۔ رات ہوئی، تو رہبر نے کہا: "راستے کی سمت معلوم کرنا نہایت ضروری ہے؛ ورنہ اسی صحرا میں ہلاک ہو جائیں گے۔" ساری رات چاند کی روشنی میں چلتے رہے۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزرا، رات بھر پھر سفر کیا، صبح ہوتے ہوتے ہمارا ایک ساتھی نڈھال ہو گیا۔

پانی اور زادِ راہ ختم ہو چکا تھا، پیاس کے مارے زبان خشک ہو گئی تھی۔ آخر دن گزارنے کے لیے ایک جگہ ٹھہر گئے۔ ہمارا رہبر ہمیں چھوڑ کر ایک طرف کو دُور نکل گیا۔ دو گھنٹے کے بعد آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس نے بتایا کہ دُور کچھ درخت سے نظر آ رہے ہیں، دو تین گھنٹے کی مسافت ہو گی، اُمید ہے وہاں ضرور پانی ہو گا اور راستے کا بھی پتہ چل سکے گا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہاں تک پہنچا کیسے جائے۔ ہمارے بیمار ساتھی میں ایک قدم اُٹھانے کی سکت بھی نہ تھی۔ رہبر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ بیمار نے کہا:

"بھائیو! مجھے آپ لوگ یہیں چھوڑ دیں، آپ سے کوئی گلہ نہ ہو گا۔ میں تو گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہوں، میری خاطر اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالیں۔"

لیکن ہم نے اُسے یُوں مرنے کے لیے چھوڑ کر چلے جانے سے اِنکار کر دیا۔ بے اختیار ہمارے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھ گئے۔ دیر تک بارگاہِ الٰہی میں زاری کرتے اور سلامتی کی دُعا مانگتے رہے۔ دُعا مانگ چکے، تو مَیں نے دل میں ایک عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔ ہمارے رہبر نے اللہ کا نام لیا اور اُس بیمار کو کندھے پر اُٹھا لیا۔ مَیں آج بھی تصور کرتا ہوں، تو اُس مردِ خُدا کی ہمّت اور طاقت پر حیرت ہوتی ہے۔ وہ خود بھی کئی روز سے بھُوکا تھا، پیاس اُسے بھی لگ رہی تھی، لیکن بالکل اپنے جیسے ایک نوجوان کو اُٹھائے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ شکیزے اور دوسرا سامان مَیں نے اُٹھا رکھا تھا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے بمشکل گھسٹتے ہوئے چل رہے تھے۔

ہمارے رہبر نے تو تین گھنٹے کی مسافت کا اندازہ کیا تھا، مگر ہم تقریباً گھنٹے سوا گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ وہ درخت نہیں ٹیلے تھے۔ ابھی ایک فرلانگ دُور تھے کہ ہمارا دوسرا ساتھی نڈھال ہو کر گر پڑا۔ مَیں نے اُسے اُٹھانے کی کوشش کی، مگر خود بے سکت ہو رہا تھا، بے بس ہو کر رہ گیا۔ رہبر نے اُسے وہیں چھوڑا، مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ ٹیلوں کے پاس پہنچ کر پہلے بیمار کو بیٹھے سے اُتارا اور لٹا دیا، پھر دوسرے ساتھی کو اُٹھا لایا۔ دونوں ساتھیوں کی حالت بے حد خراب تھی۔ پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئی تھیں۔ رہبر نے انہیں ہاتھ سے ہوا کی۔ مَیں شکم پشم ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ دوسری جانب بالکل متصل ایک اور ٹیلہ تھا۔ دونوں کے درمیان ایک چھوٹی سی وادی بن گئی تھی۔ مَیں نیچے اُترا، وادی میں پہنچا اور اللہ کا نام لے کر خنجر سے ریتلی زمین کھودنے لگا۔ تقریباً چار بالشت زمین کھودی تھی کہ گیلی ریت نکلنا شروع ہو گئی۔ مایوسی کے اندھیروں میں اُمید کی کرن چمک اُٹھی۔ کوئی ایک فٹ گڑھا اور کھودا تھا کہ پانی پھُوٹنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چلّو بھر پانی جمع ہو گیا۔ چکھ کر دیکھا، تو میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔ فرطِ مسرّت سے جسم میں طاقت عود کر آئی۔ بھاگم بھاگ ساتھیوں کے پاس پہنچا، دُور ہی سے چلّایا: "پانی، پانی"۔ مشکیزہ اور ڈونگا اٹھایا اور "چشمے" کی طرف لپکا۔ آ کر دیکھا، تو گڑھا پانی سے بھر چکا تھا۔ تھوڑا سا پانی خود پیا، کئی دن کے بعد حلق تر ہوا، تو رُوئیں رُوئیں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، پھر مشکیزہ بھرا اور ساتھیوں کے پاس پہنچ کر قطرہ قطرہ اُن کے مُنہ میں ٹپکایا، پھر مُنہ اور جسم پر پانی کے چھینٹے مارے۔ کوئی گھنٹے بھر کی تگ و دَو کے بعد وہ ہوش میں آ گئے۔ رہبر اور مَیں دونوں اپنے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔

پانی نے ہماری زندگی بچا لی۔ یہاں ہم ایک دن اور رات ٹھہرے۔ میرے توروے میں تالقان موجود تھا، پانی ملا، تو تھوڑا سا گھول کر دونوں مریضوں کو کھلایا اور خود بھی کھایا۔ رفتہ رفتہ کھوئی ہوئی طاقت عود کر آئی۔ دونوں ساتھی بھی اُٹھ بیٹھے اور جب چلنے کے قابل ہو گئے، تو ہم نے شکیزے بھرے اور روانہ ہو گئے۔ ٹیلوں کی قطار سے گزرتے ہوئے ایک وسیع و عریض میدان میں پہنچے۔ دو گھنٹے یہاں آرام کیا، پھر چل کھڑے ہوئے۔ کچھ سفر طے کیا تھا کہ صبح ہو گئی اور ہم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ اب ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے تھے جس کی زمین نیم ریتلی، اُونچی نیچی، وادی نما اور درختوں اور قدِ آدم جھاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہمارا رہبر راستے کی تلاش میں نکل گیا۔ دوپہر

کے قریب لوٹ کر آیا، کہنے لگا:

"سمت کا پتہ چل گیا ہے، ہم ریگستان میں بس چکر ہی کاٹتے رہے ہیں، کاروانی راستہ بہت دُور رہ گیا ہے۔ کرخی یہاں سے صرف دو دن کی مسافت پر ہے، قریب ہی پانی اور پھل دار درخت ہیں، آپ لوگ وہاں ٹھہریں، مَیں کرخی جا کر زادِ سفر اور کوئی سواری لے آتا ہوں۔"

لیکن بیمار ساتھی کرخی واپس جانا چاہتے تھے، اِس لیے ساتویں دن کرخی روانہ ہو گئے۔

(۷)

سات دن اور آٹھ راتیں "صحرانوردی" کے بعد واپس کرخی پہنچ گئے۔ شہر سے دو میل کے فاصلے پر مَیں نے ہم سفروں سے رخصت لی اور اکیلا چل کھڑا ہوا۔ رات اور اگلے دن دوپہر تک کا وقت تُوت کے جنگل میں گزارا۔ اگرچہ مَیں ناکام و نامراد واپس آ گیا، تاہم میرا دل پھر بھی مطمئن تھا۔ استخارہ کیا، تو اس اطمینان میں اور اضافہ ہو گیا۔ مسجدِ سرائے میں پہنچا، نمازِ ظہر ہو چکی تھی، وُضو کیا اور اکیلا نماز پڑھنے لگا۔ سُنتیں پڑھ کر سلام پھیرا، تو دیکھا کہ ایک شخص ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے۔ کھٹکا، شاید کوئی جاسُوس ہے۔ نماز پُوری کی اور دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ دیر تک دُعا مانگتا رہا۔ اِس دوران میں اُس شخص کی نظریں مجھ پر مرتکز ہی رہیں۔ آہستہ آہستہ سرک کر میرے قریب پہنچ گیا۔ مَیں نے دُعا مانگ کر اُٹھنا چاہا، تو میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا، پُوچھا:

"یہاں کیسے پہنچے؟"

"مَیں تو ہمیشہ یہاں آتا ہوں۔" مَیں نے جواب دیا۔

"ساربان ہو؟"

"نہیں، دہقان ہوں۔"

"یہاں کے تو نظر نہیں آتے؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"یہ مسجد افغانستانی قافلوں کے لیے مخصوص ہے، یہ سرائے بھی انہی لوگوں کی ہے، کسی دوسرے کے لیے یہاں آنا ممنوع ہے۔"

اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص کونسٹوں کا جاسُوس ہے اور اب کوئی راہِ فرار نہیں رہی، تاہم گھبرانے کے بجائے پُورے اطمینان سے کہا:

"اگر آپ میرے بارے میں تحقیقات کرنا چاہتے ہیں، تو اپنے دفتر یا کسی اور جگہ لے چلیے، یہاں خانۂ خدا میں نہیں۔"

وہ ہنس پڑا اور بولا:

"تم افغانستان جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"ضرور۔" مَیں نے جواب دیا۔

"کچھ پیسہ وَیسہ ہے؟"

"کس قدر؟" مَیں نے دریافت کیا۔

"ایک گدھا خرید جا سکے۔"

"مَیں دو گدھے خرید کر دے سکتا ہوں۔"

"بس بس پیسہ اپنے پاس رکھو اور میرے پیچھے چلے آؤ۔" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ مَیں اس کے پیچھے ہو لیا، وہ مجھے سرائے کے ایک کمرے میں لے گیا، وہاں تین آدمی اور بیٹھے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ شخص قافلے کا سردار ہے، اس کا نام دولت قل تھا، خاصا پڑھا لکھا تھا۔ عربی اور فارسی اپنی مادری زبان ترکمن کی طرح بولتا تھا۔ اُس کو آتے دیکھ کر تینوں آدمی احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے اور "دولت آغا" کہہ کر مخاطب کیا۔ دولت آغا نے حکم دیا کہ اس نوجوان کے لیے ایک چپان لاؤ۔ چپان ترکمن قبیلے کے شتربانوں کا خاص لباس ہے۔ ایک آدمی اُٹھا اور چپان لے آیا۔ مَیں نے پہنا، تو ہُو بہُو ترکمن شتربان نظر آنے لگا۔ دولت آغا مجھے دیکھ کر مُسکرایا، دو گدھے بھی خرید لیے گئے۔ اگلے روز دولت آغا کے پچاس کے لگ بھگ اُونٹ آ گئے اور مَیں دوسرے ترکمن شتربانوں کے ساتھ ان اُونٹوں کا شتربان بن کر روانہ ہو گیا۔ دولت آغا خود ساتھ نہیں تھا۔ دو گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہم ایک بہت بڑی قلعہ نما حویلی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اندر گئے، تو تُوت کے

درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا، دولت آغا درختوں کے سائے میں بیٹھے تھے، ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ ایک بوڑھے ترکستانی عالم اور دوسرے ایک ترکمن نوجوان، شاید دولت آغا کا عزیز تھا۔ بزرگ بڑی شفقت سے ملے۔

کھانے سے فارغ ہو کر دولت آغا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ بزرگ بخاری استاد بھی تمہارے ساتھ ہجرت کریں گے آپ لوگوں کے ساتھ دو ترکمن جائیں گے۔ ایک گدھے پر بزرگ سوار ہوں گے اور دوسرے پر آپ۔ ان ترکمنوں میں سے ایک امیر ہوگا اور اُس کی رہنمائی میں سفر کرنا ہوگا، قافلہ رات گئے روانہ ہوگا، دارالاسلام پہنچ جائیں، تو اس سرائے کے حق میں دُعا کرنا۔"

وقت مقررہ پر قافلہ روانہ ہوگیا۔ نوجوان ترکمن نے سفر کی ہدایات جاری کر دیں۔ دونوں ترکمن نوجوان رائفلوں سے مسلح تھے۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے الگ خاصے فاصلے پر سفر کرتے رہے۔ ایک ترکمن آگے آگے تھا اور دوسرا پیچھے۔ کاروانی راستے سے ذرا ہٹ کر ہم رات بھر سفر کرتے رہتے اور دن بھر جھاڑیوں میں چھپ کر پڑ رہتے۔ راستے میں دو مرتبہ رُوسی فوجی نظر آئے لیکن اللہ نے ہمیں ان کی دستبُرد سے بچائے رکھا۔ اب ہم سرحد کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ ہمارے امیر نے پھر ہدایات جاری کیں۔ ہمیں ایک ایسے مقام سے سرحد پار کرنا تھی جہاں دُور دُور تک چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور زمین سخت ناہموار، ریتیلی اور حشرات الارض سے پٹی ہوئی تھی۔

صبح صادق طلوع ہو رہی تھی کہ ہم نے سرحد پار کر کے دارالاسلام افغانستان میں قدم رکھا۔ مارے خوشی کے میں تو دیوانہ ہوگیا۔ جھاڑیوں ہی میں سجدے میں گر پڑا اور زبان پر حمد و ثنا جاری ہوگئی۔ سجدۂ شکر ادا کر کے اُٹھا، تو بے اختیار پکارا: "دارالاسلام، تیری مٹی میرے لیے خاکِ شفا اور سرمۂ صفا ہے، اے ملّتِ افغان، تو خوش بخت ہے، سعادت مند ہے، تجھے اللہ کی عظیم نعمت حاصل ہے، آزادی اور اسلام کی نعمت، تجھے شاید اس کی قدر و قیمت معلوم نہ ہو، اس نعمت کی قدر تو ہم جانتے ہیں، اللہ تجھے تا قیامت اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ کرے۔"

سمرقند و بخارا کی خُونیں سرگزشت یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ آگے میری اپنی داستانِ حیات چلتی ہے۔ اندخوئی (سرحدی شہر) کے کمشنر نے مجھے واپس بھیجنا چاہا، مگر شہر کے مسلمان میری حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسے اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا۔ اندخوئی سے گوناگوں مشکلات سے گزرتا ہوا ہرات پہنچا، وہاں مولانا جامی کے مزار پر حاضری دی، والدہ ماجدہ کی نصیحت کے مطابق قرآن مجید کی جلد پھاڑنے کی کوشش کی، مگر وہ بڑی سخت تھی، آخر ایک طالب علم سے تیشہ لے کر آیا اور جب اس سے جلد کے ٹکڑے کیے تو کشمکش رہ گیا، پوری جلد میں امّی جان نے اشرفیاں بھر دی تھیں۔ ان اشرفیوں سے غریب الوطنی میں بڑے کام نکلے اور برصغیر پاکستان و ہند پہنچ کر انہی کے سہارے دینی تعلیم پوری کی۔ ■■

ترجمان افکار لائبریری
بیاد اعظم ہاشمی ترک (رح)
کتاب #05
tarjumaneafkar@yahoo.com